پاکستانی ادب کے معمار

احمد بشیر: شخصیت اور فن

محمد ظہیر بدر

اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

احمد بشیر: شخصیت اور فن

محمد ظہیر بدر

اکادمی ادبیات پاکستان

نگرانِ اعلیٰ	ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
منتظم	ڈاکٹر راشد حمید
نگران منصوبہ و طباعت :	علی یاسر
مصنف	محمد ظہیر بدر
نظرِ ثانی	الطاف قریشی
تدوین	ڈاکٹر صلاح الدین درویش
ٹائٹل	سجاد احمد
اشاعت اول	2016ء
تعداد	500
ناشر	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	نسٹ پریس، اسلام آباد
قیمت	مجلد:-/260 روپے
	غیر مجلد:-/240 روپے

ISBN: 978-969-472-291-7

فہرست

پیش نامہ

احمد بشیر کا شمار پاکستانی ادب کی ہمہ جہت شخصیات میں ہوتا ہے۔ بحیثیت ایک ناول نگار، خاکہ نگار، کالم نگار، افسانہ نگار، مکتوب نگار، صحافی اور فلم ساز انھوں نے پاکستانی ادب کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ نظریاتی طور پر وہ ترقی پسند ادب سے جڑے ہوئے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی لکھتوں میں ہمیشہ خستہ حال اور پسے ہوئے طبقے کے مسائل اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی تحریر و تصنیف میں صرف کی۔ ابتدا میں احمد بشیر شاعری بھی کیا کرتے تھے لیکن بعد ازاں انھوں نے اپنے آپ کو نثر کی مختلف اصناف تک محدود کر لیا۔ احمد بشیر ایک ایسے ادیب اور دانشور تھے جنھوں نے امید اور روشن امکانات کے چراغ روشن رکھے۔

پاکستانی ادب کے معمار کے سلسلے کے تحت شائع ہونے والی یہ کتاب احمد بشیر کی شخصیت اور اُن کے ادبی کارناموں کا مختصر مگر جامع احاطہ کرتی ہے۔ اس سلسلے کے تحت شائع ہونے والی کتابوں کا بنیادی مقصد جہاں ایک طرف عوام کو اپنے مشاہیر کے ادبی کارناموں سے روشناس کرانا ہے تو دوسری طرف مستقبل کے محقق اور طلبہ کو بنیادی مواد فراہم کرنا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے ہم نے ان کتابوں میں حواشی و حوالہ جات کا باقاعدہ اہتمام کیا ہے تا کہ محققین و طلبہ کو ان شخصیات پر کام کرنے میں سہولت رہے۔

کتاب کے مصنف جناب محمد ظہیر بدر نے جو خود ایک معروف ادیب اور محقق ہیں، بڑی محنت اور لگن سے اکادمی ادبیات پاکستان کی درخواست پر کتاب مکمل کی ہے۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب بھی قارئین کو پسند آئے گی۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو
چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان

پیش لفظ

ان قارئین کے برعکس جنہوں نے احمد بشیر کو ان کی تحریروں ہی میں دیکھا۔ میرا احمد بشیر سے ایک تعلق قاری اور لکھاری کے علاوہ یہ بھی ہے کہ وہ روزنامہ امروز کے اولین لکھنے والے تھے اور میں امروز کے آخری لکھنے والوں میں تھا۔ جب مجھے تین شخصیات میں سے کسی ایک شخصیت کی حیات وفن پر لکھنے کی پیشکش ہوئی تو میں نے ان میں سے جناب احمد بشیر کا انتخاب اس لیے کیا کہ ان کی شخصیت میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ احمد بشیر کے بارے میں احوال وآثار کی تلاش میں مجھے ان کے دوستوں اور اہل خانہ کے ساتھ گفتگو اور ملاقات کا موقع ملا۔ ان کے خاندان کے جملہ افراد نے اپنی معروفیات سے وقت نکال کر ترجیحاً مجھے وقت دیا اور نہایت تسلی اور تحمل سے میرے سوالوں کے جواب دیے۔ ان کا بیٹا امریکہ میں مقیم ہے اس لیے اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ البتہ ان کے داماد (سب سے چھوٹی بیٹی اسماء کے شوہر) کرنل عباس گل، سسر کی فکر و دانش اور آدرشوں کے حامل ہیں۔ ان سے ملاقاتیں خوب رہیں۔ احمد بشیر کی بیٹیاں اور داماد انھیں 'ابا' کہہ کر پکارتے تھے، اب بھی ابا کہہ کر انھیں یاد کرتے ہیں تو ان کے لہجے میں اپنے ابا کی لافانی محبت چھلکتی محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ کتاب میں احمد بشیر کے لیے والد یا باپ کے بجائے 'ابا' لکھا گیا ہے۔

احمد بشیر کے احوال وآثار کی تلاش میں نکلا تو پتہ چلا کہ اخبارات و جرائد میں چھپنے والے تعزیتی اور تعریفی بیان، خبریں اور تاثراتی مضامین کا انداز اور معیار رسمی اور روایتی ہے اور کوئی بھی مضمون ان کے فکر وفن کا احاطہ نہیں کرتا۔ مختلف واقعات کی تکرار ہے جو ان کے خاکوں، مضامین اور سوانحی ناول کے علاوہ دیے گئے انٹرویوز میں بھی من وعن موجود تھے۔ مگر یہ بات خوش آئند ہے کہ تحقیق و تنقید کے شعبے میں احمد بشیر پر قابل ذکر کام کا آغاز ہو چکا ہے۔ چند سال پہلے فیصل آباد کے جناب ریاض احمد ریاض نے بعنوان، ''احمد بشیر، حیات وادبی خدمات'' ایم فل کا مقالہ لکھا اور ان دنوں ان کا احمد بشیر پر پی ایچ ڈی کا مقالہ آخری مراحل میں ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں دیگر بنیادی ماخذ اور مصاحبوں کے ساتھ ساتھ

ریاض احمد صاحب کے مقالے سے استفادہ بھی کیا گیا ہے۔

احمد بشیر کی تحریروں پر ابھی بہت سا کام ہونا باقی ہے۔ احمد بشیر کی قلمی جانشین، ان کی دختر بزرگ محترمہ نیلم احمد بشیر ان کی تحریروں کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کی مساعی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ "ابا جن دنوں بیمار تھے۔ میں نے ان کے امروز اور مساوات میں چھپنے والے کالموں کا مسودہ ایک پبلشر کو دیا تھا۔ میری آرزو تھی کہ ابا کی زندگی ہی میں چھپ جائے اور میں انھیں سرپرائز دوں مگر "اے بسا آرزو کہ خاک شد"۔ پبلشرز کے روایتی تساہل اور ترجیحات کے باعث یہ مسودہ احمد بشیر کے انتقال کے بعد بارہ سال تک التوا کے لامتناہی زینے چڑھتا اترتا رہا۔ ایک کتاب "میں اور احمد بشیر" کے نام سے شائع ہو چکی ہے، جو ان کی بیوی نے تحریر کی ہے۔ عصرِ حاضر میں غیبت، منافقت اور مصلحت کے اندھیروں میں احمد بشیر نے اپنی حرمتِ فکر سے جو جرأتوں کے چراغ روشن کئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے ان کا نام بجا طور پر پاکستانی ادب کے معماروں میں شامل ہونے کا جواز رکھتا ہے۔ میں اکادمی ادبیات کے موجودہ سربراہ ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو کا انتہائی ممنون ہوں کہ تعطل کے شکار اس منصوبے کو انھوں نے اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہوئے فوری اشاعت کے احکامات جاری کیے۔ اشاعتی منصوبے "پاکستانی ادب کے معمار" کے انچارج، عزیز دوست اور معروف شاعر علی یاسر بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت میں بہت دلچسپی لی اور مجھے قیمتی مشوروں سے نوازا۔

مجھے ان سطور میں اس حقیقت کا اعتراف بھی کرنا ہے کہ اگر جناب ڈاکٹر یونس جاوید نے احمد بشیر مرحوم کے ادبی کام کو ترتیب وتدوین کے زیور سے آراستہ نہ کیا ہوتا تو یہ خاکے شاید اخبار کے صفحات میں کرم خوردگی کا شکار ہو رہے ہوتے۔ اس بے مثال خدمتِ ادب پر میں ڈاکٹر یونس جاوید کے لئے تحسین گزار ہوں۔

جب اس کام کا آغاز کیا تھا، اس وقت دیگر شخصیات کے علاوہ سید سبطِ الحسن ضیغم، حمید اختر، زاہد عکاسی، احمد عقیل روبی اور اظہر جاوید نے بھی راقم کو احمد بشیر کے بارے میں بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائیں۔ آج یہ شخصیات دنیا میں موجود نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

محمد ظہیر بدر، لاہور

mzaheer58@gmail.com

احمد بشیر، منو بھائی، حسین نقی، شیری رحمان اور دیگر

ممتاز مفتی، فیض احمد فیض، صدیق سالک، احمد بشیر اور دیگر

باب۔(۱)

احمد بشیر کے حالاتِ زندگی

خاندانی و تہذیبی پس منظر

ایمن آباد، لاہور سے جی ٹی روڈ پر گوجرانوالہ جاتے ہوئے کوئی تیس پینتیس میل کے فاصلے پر دائیں طرف مغلیہ دور کا ایک قصبہ ہے۔ یہاں تقسیم سے پہلے دو قومیں آباد تھیں۔ ایک تو ہندو دیوان تھے جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خزانچی تھے۔ جب گلاب سنگھ نے انگریزوں سے کشمیر خریدا تھا تو رقم دیوانوں سے لے کر ادا کی تھی۔ مشہور تھا کہ دیوانوں کے تہہ خانے سونے کی اینٹوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ دیوان پرانے رئیس تھے اور یہاں بڑے ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ دوسری قوم نومسلم شیخ تھے۔ جو چھوٹا موٹا کاروبار اور دکانداری وغیرہ کرتے تھے۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی یہاں اکثریت نومسلموں کی تھی جو اپنے آپ کو شیخ کہلاتے تھے۔(۱)

اتنے سال گزر جانے کے باوجود آج بھی اس قصبے کے پرانے مکان محلے، گلیاں اور قدیم طرزِ تعمیر کے بوسیدہ نشانات اس کی قدامت اور عظمت رفتہ کی کہانی سناتے ہیں۔ احمد بشیر نے اپنے آپ کو کشمیری پنڈتوں کی اولاد لکھا ہے۔ ان کے جد امجد ایک فقیر کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔ وہ پشمینے اور سن مرگ کا کچا نیلم لے کر لاہور آیا کرتے تھے۔ جو اس زمانے میں ایسی اشیاء کی منڈی تھا۔(۲)

قیام پاکستان سے پہلے یہاں پر نومسلم شیخوں میں کئی قومیں تھیں جن میں متھے، نارو، وروڑے، کاشل، گپتے اور آنند، زیادہ قابل ذکر ہیں۔ معاشی اعتبار سے یہ لوگ چھوٹی موٹی تجارت یا کاروبار کرتے تھے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی یہاں بہت کم تعداد تھی۔ ان تعلیم یافتہ افراد میں شیخ غلام حسین بھی تھے۔ ان کے والد خدا بخش کی کپڑے کی دکان تھی۔ وہ اٹھارہ سال کی عمر میں انتقال کر گئے تھے۔ جس کے بعد ان کی تعلیم و تربیت ان کے چچا نے کی۔ ہر چند کہ ان کے خاندان میں اعلیٰ تعلیمی اقدار کا کوئی پس منظر نہیں تھا۔ سیدھے سادے کاروباری لوگ، واجبی سی تعلیم۔۔۔ مگر ان کے چچا نے ان کی تربیت جدید زمانے کے مطابق کی۔ چنانچہ شیخ غلام حسین نے یتیمی میں زندگی بسر کی۔ مگر انھوں نے ہمت اور

محنت سے نہ صرف اپنے خاندان کی پرورش کی بلکہ خود کو بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔انھوں نے ایف سی کالج سے ایم اے فارسی کیا اور پھر تاریخ میں بھی ایم اے کیا اور ایمن آباد ہی میں ایک نجی تعلیمی ادارے میں پڑھانے لگے۔ جب وہ اکیس سال کے تھے تو ان کی والدہ بھی انتقال کر گئیں۔ وہ ایک سیلف میڈ انسان تھے جنھوں نے محنت اور توکل سے زندگی کے لیے مال و اسباب اکٹھا کیا۔ وہ بہت دیانت دار اور پرانی روایات کے امین تھے۔ فکری سطح پر علامہ اقبال سے بہت متاثر تھے اور زمانۂ طالبعلمی میں علامہ اقبال کی صحبت میں بیٹھا کرتے تھے۔ ان سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ اردو اور فارسی ادبیات اور شاعری پر ان کی گہری نظر تھی۔ خاص طور پر مولانا روم اور حافظ کا بہت سا کلام ازبر تھا اور کلام اقبال کے تو وہ عاشق تھے۔ شروع شروع میں شاعری بھی کرتے تھے اور انھوں نے اپنا تخلص واقف رکھا تھا۔ شعبۂ تعلیم سے تعلق ہونے کی وجہ سے گھر میں بہت سی کتابیں موجود تھیں۔ ان کا شمار ایسے انسانوں میں کیا جا سکتا ہے۔ جن کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی پر اصول مقدم ہیں۔ جو اصولوں کو زندگی کا پابند بنانے کے بجائے زندگی کو اصولوں پر قربان کرنے کا آدرش رکھتے ہیں۔ ان کے برعکس ان کی اہلیہ ممتاز بیگم کی تعلیم مڈل تک تھی۔ اس زمانے میں لڑکی کا مڈل تک پڑھ لینا بھی ایک غیر معمولی بات تھی۔ چنانچہ وہ کافی روشن خیال اور زمانے کی بدلتی ہوئی کروٹوں سے آگاہ تھیں۔ ان کا تعلق ایک امیر گھرانے سے تھا۔ ان کے والد بڑے سرکاری افسر تھے۔ ان کے نانا اپنے قصبے کے تحصیل دار تھے۔ ان کا گھرانہ قدرے روشن خیال بھی تھا۔

پیدائش اور گھریلو ماحول

احمد بشیر ۲۴۔دسمبر ۱۹۲۳ء میں اسی ایمن آباد، ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔(۳) اور اسی قسم کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد شیخ غلام حسین نے ان کا نام شیخ بشیر حسین رکھا۔ جب انھوں نے اوائل جوانی میں شاعری شروع کی تو اپنا نام بشیر رومانی رکھا۔ مگر شاعری ان کے مافی الضمیر کی ادائیگی میں ان کا ساتھ نہ دے پائی۔ پھر انھوں نے اپنا نام احمد بشیر رکھ لیا (اور پھر اسی نام سے معروف ہوئے)۔ احمد بشیر کل پانچ بہن بھائی بہ ترتیب، احمد بشیر، اختر عکسی، ثریا، پروین (بیگم پروین عاطف) اور فرخ جمیل تھے۔ فرخ جمیل شیخ جو سب سے چھوٹے تھے۔ بچپن میں پولیو کی وجہ سے ان کا ایک ہاتھ اور پاؤں کمزور رہ گئے، جس کی وجہ سے وہ زیادہ تعلیم نہ حاصل کر سکے۔ نہ ہی ان میں کوئی جینے کی امنگ رہی کہ وہ اپنے آپ کو زندگی کے امتحان میں کھڑا کر سکیں۔ انھوں نے مجرد زندگی گزاری۔ چند سال قبل ان کا لاہور میں انتقال ہوا۔ ان کی والدہ ایک سخت گیر عورت تھیں۔ انھوں نے پیار کے بجائے اپنے انداز سے ان کی

تربیت پر زیادہ توجہ دی۔ ابھی ان کے گھرانے میں اولاد پر سختی کر کے اسے نگرانی میں رکھنے کا رواج جاری تھا۔ اس لیے انہیں بھی انہی پابندیوں سے گزر کر آزادی حاصل کرنا پڑی۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بے جا روک ٹوک اور دباؤ سے اولاد کی شخصیت پر ناخوشگوار اثرات پڑتے ہیں اور ذہنی وفکری سطح پر انسان فرسودہ روایات ہی کا پابند ہو کر رہ جاتا ہے۔ احمد بشیر کبھی کبھار ماضی کو یاد کرتے تو ماں کے امتیازی سلوک اور سخت گیری کو یاد کر کے افسردہ سے ہو جاتے تھے، ان کے لہجے میں محرومی جھلکنے لگتی۔ (۴)

تعلیم وتربیت

احمد بشیر نے ابتدائی تعلیم ایمن آباد میں حاصل کی۔ وہ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ میں ٹاٹوں پر بیٹھ کر پڑھا ہوا ہوں۔ کیونکہ والد کا تعلق شعبہ تعلیم سے تھا اس لیے سکول کے بعد گھر آ کر بھی تعلیم کا سلسلہ اسی طرح جاری رہتا۔ اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ روزانہ سات سے آٹھ گھنٹے تک گھر میں پڑھتا تھا۔ موجودہ گورنمنٹ اسلامیہ ہائیر سیکنڈری سکول اور اس وقت کا اسلامیہ ہائی سکول احمد بشیر کی اولین درس گاہ تھی۔ مقامی سیاست میں سیاسی دھڑے بندیوں کے باعث اس سکول سے ان کے والد کی ملازمت ختم ہو گئی۔ جس کے بعد ۱۹۳۸ء میں شیخ غلام حسین کو سری نگر سکول میں ہیڈ ماسٹر کی نوکری مل گئی اور وہ فوراً سری نگر چلے گئے اور وہاں رہائش کا بندوبست کر کے انھوں نے اپنے بیوی بچوں کو بھی کشمیر آنے کا پیغام بھیج دیا۔ چنانچہ سارا گھرانہ ایمن آباد سے سری نگر منتقل ہو گیا اور احمد بشیر اپنے بچپن کے دوستوں اور سکول کے ساتھیوں کو چھوڑ کر کشمیر روانہ ہو گئے۔

اُن دنوں کشمیر کا سفر خاصا دشوار ہوتا تھا۔ سری نگر جاتے ہوئے رات مسافروں کو راستے میں بسر کرنا پڑتی تھی۔ سری نگر پہنچ کر احمد بشیر کو اسلامیہ ہائی سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ اسی ادارے میں ان کے والد صاحب کو ملازمت ملی تھی۔ کچھ دنوں بعد احمد بشیر کشمیر کی فضاؤں اور ماحول میں گھل مل گئے۔ اس سکول میں ''ہاتو'' بہت زیادہ تھے۔ کیونکہ ان کے سکول میں ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان کی حالت معاشی حوالے سے خاصی کمزور تھی۔ یہ ''ہاتو'' کشمیر میں معاشی سطح پر طبقاتی تقسیم کی علامت تھے۔ یہ غریب مسلمان سردیوں میں میدانی علاقوں کی طرف آ جاتے اور گرمیوں میں کشمیر میں محنت مزدوری کرتے۔ سری نگر میں سردیوں میں چھٹیاں ہوتی تھیں اور احمد بشیر چھٹیوں میں اپنے آبائی قصبے میں آ جاتے اور پھر اپنے والدین کے ساتھ سری نگر چلے جاتے۔ یہیں انھوں نے بی اے کا امتحان جموں یونیورسٹی، سرینگر (کشمیر) سے پاس کیا۔ انہیں مطالعے کا شروع ہی سے شوق تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ

ان کے والد کو مطالعے کا بہت شوق تھا چنانچہ انھوں نے مطالعے کا شوق اپنے گھر ہی کے ماحول سے پایا۔ مطالعے کے علاوہ انہیں کھیلوں میں کرکٹ کا بے حد شوق تھا۔ جبکہ ان کے والد قدامت پسند ماہر تعلیم تھے۔ ان کا خیال تھا کہ احمد بشیر کی یہ عمر تعلیم ، یعنی نصابی تعلیم ، حاصل کرنے کی ہے چنانچہ وہ انہیں کرکٹ کھیلنے سے منع کرتے تھے۔ مگر احمد بشیر نے سرکش طبع پائی تھی۔ مگر ابھی ایسی عمر تو نہ تھی اور نہ ہی آج ایسا بے باک اور بے لحاظ انسانی شعور، کہ کھل کر سامنے کھڑے ہو کر اپنے بنیادی انسانی حقوق کا نعرہ بلند کرتے ۔البتہ وہ چوری چھپے ان کی اس خواہش کے برعکس برابر کرکٹ کھیلتے رہے۔ کبھی کبھار جب ان کے والد کو ان کی اس نافرمانی کا پتہ چلتا تو وہ کبھی ڈانٹ کر کبھی طنزیہ جملوں میں ان کی کلاس لیتے ۔ مگر احمد بشیر کا ردعمل 'سووٹ ۔۔! so what' میں ڈھلتا گیا۔ آگے چل کر یہی سووٹ کا فلسفہ جب ممتاز مفتی کی صورت میں سامنے آیا تو انھوں نے اس پر لبیک کہا اور مفتی کے ساتھ مفتی ہو گئے۔ پروین عاطف نے بچپن کی یادیں اجالتے ہوئے اپنے مہربان بھائی کی نوجوانی کی جو تصویر بنائی ہے اس میں ان کے لڑکپن کے ایک عشق کی خوشبو بھی سمائی ہوئی ہے۔ پروین کہتی ہیں:

> "بھائی مجھے کبھی کبھار لیٹر بکس میں ڈالنے کے لیے خط بھی دیتے تھے اور ساتھ میں یہ تاکید بھی کر رکھی تھی کہ میں اس بارے میں کسی کو نہ بتاؤں۔ میں تو بچی تھی مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ یہ خط کسے لکھتے ہیں۔البتہ ہمارے ہمسائے میں ایک لڑکی تھی ۔۔۔ سرمو۔۔ اس کا نام تھا۔ یہ بات میرے معصوم مشاہدے میں شامل ہے کہ وہ بھائی جان کو اور بھائی جان اسے دیکھ کر مسکرایا کرتے تھے۔ وہ مجھ سے بھی بہت پیار کیا کرتی تھی ویسے میں نے اسے اور بھائی جان کو کبھی ملتے نہیں دیکھا تھا۔"

پروین عاطف نے چوری چوری خط لیٹر بکس میں ڈالنے کی جو بات کی ہے۔ وہ یہ خط کسے ڈالتے تھے پروین کے عجز کے باوجود مکتوب الیہ کا سراغ "دل بھٹکے گا" کے مندرجات میں یوں ملتا ہے۔ دراصل ایمن آباد میں ان کا واحد دوست نذیر قیصر تھا (ناول میں اس کا نام فدا محمد لکھا گیا ہے) ان کے والد نذیر قیصر سے احمد بشیر کی دوستی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس کے ساتھ کسی قسم کے رابطے پر پابندی تھی۔ مگر احمد بشیر پابندیوں کی خلاف ورزی کے خوگر تھے۔ چنانچہ وہ کشمیر سے چوری چھپے نذیر قیصر کو خط لکھا کرتے تھے۔ اسی لیے وہ خط پوسٹ کرنے کے لیے پروین کو دیتے تھے اور اسے منع رکھا تھا کہ وہ کسی کو نہ بتائے۔ پروین کا کہنا ہے کہ بھائی جان بچپن ہی سے ضدی تھے۔ ان کی یہی ضد آگے چل کر ان کے آدرشوں پر ڈٹے رہنے کی صورت میں ڈھل گئی۔

کشمیر میں قیام کے دوران میں انھوں نے کشمیر کی وادیوں کی بھرپور سیاحت کی اور چشمہ، ویری ناگ بھی دیکھا، ڈونگا کشتی میں ڈل جھیل کی سیر کی اور اس کے کناروں پر پرانی عمارات اور باغات کی سیاحت سے لطف اٹھایا۔ داراشکوہ کی لائبریری کے کھنڈر اور شنکر اچاریہ کا مندر دیکھا اور ساتھ ہی ساتھ "**پنجیب**" کے حوالے سے آگہی حاصل کی۔(۵)

یہی انھوں نے کالج کی لائبریری سے کتب لے کر جو پڑھنا شروع کیں تو سب کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ان میں مختلف موضوعات مثلاً تواریخ عالم اور خاص طور پر ترقی پسند مصنفین کی کتب شامل تھیں۔ اس مطالعے نے ان کے ذہنی افق اور فکری جہتوں کا تعین کرنے میں بڑی رہنمائی کی۔ انھوں نے سری نگر سے کسی اور مقام کی طرف جانے کی جستجو شروع کر دی۔ الہ آباد، پٹنہ، بنارس، آسام کے علاقوں میں پھرتے رہے۔ یہاں تک کہ مہاراشٹر اور بنگال کے تعلقوں میں بھی سفر کیا۔ کشمیر میں نواب پٹودی، لالہ امرناتھ، نذر محمد اور دیگر مشہور کرکٹرز کے ساتھ کرکٹ کھیلنے اور سینما بینی کا مشغلہ بھی پروان چڑھ رہا تھا کہ ایک ہندو دوست کی وجہ سے ایک جھگڑے کا حصہ بنے اور معاملہ پولیس تک جا پہنچا اور اس وجہ سے سری نگر احمد بشیر سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا اور احمد بشیر اپنے ماموں شیخ اشفاق حسین کے پاس جہلم پہنچ گئے۔ یہاں احمد بشیر نے بڑی آزادی کے دن گزارے۔ چند ماہ بعد ان کے والد نے نظریاتی اختلاف کے باعث ملازمت چھوڑ دی۔(۶)

۱۹۴۲ء میں ان کے والد نے گوجرانوالہ آ کر ایک پرائیویٹ سکول میں ملازمت اختیار کر لی۔ مگر پھر چند سال بعد ہی انھوں نے کاروبار کی غرض سے یہ نوکری چھوڑ دی اور ایمن آباد واپس آ کر مرید کے اور نارنگ میں چاولوں کا کاروبار شروع کر دیا۔ احمد بشیر کا اس مسئلے پر بھی باپ سے اختلاف تھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اتنا پڑھ لکھ کر خاندانی پیشوں کے تسلسل سے خاندانی شعور کی ترقی ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ چنانچہ یہ دائرہ ٹوٹنا چاہیے۔ اس چھوٹے سے قصبے میں، جو ہر شعبے میں لاہور اور گوجرانوالہ کا رہین منت تھا، ان کا رہنا ویسے بھی مشکل تھا۔

عملی زندگی کا آغاز

احمد بشیر کے والد نے سری نگر سے نقل مکانی کرتے ہوئے انہیں دہلی رخت سفر باندھنے کی ہدایت کی۔ جہاں ان کے ایک دوست ڈپٹی سیکریٹری تھے۔ یہ ہندوستان میں سیاسی ہلچل اور عسکری کشمکش کا دور تھا۔ جنگ عظیم جاری تھی، نئے نئے محکمے کھل رہے تھے۔ ان کے والد کے اس دوست کی سفارش پر انہیں کلرک کی نوکری مل گئی۔ کچھ ہی عرصے بعد ایک انگریز افسر سے علیک سلیک کے نتیجے میں سرکار نے اسے

ایک نئے محکمے (واقع جالندھر) فوج کے پیرا ملٹری شعبے میں افسر ریکری ایشن کے طور پر تعینات کر دیا۔ یہاں ان کا عہدہ یونٹ کا تھا۔ احمد بشیر کا کام فوج کے سپاہیوں کی تفریح کے لیے مختلف ثقافتی اور تفریحی گروپ تشکیل دینا ہوتا تھا۔ یہ محکمہ گاؤں گاؤں پھر کر جاگیرداروں، چودھریوں، پنڈتوں اور مولویوں کی مدد سے کسان لڑکوں کو فوج میں بھرتی کروانے کی غرض سے ناچ گانے کا اہتمام کرتا۔ اس مقصد کے لیے بنگال سے ڈانس کرنے والے لڑکے اور لڑکیوں پر مشتمل گروپ بلوائے جاتے اور یوں دیہاتیوں کی تفریح کا سامان بھی کیا جاتا اور لوگوں کو جنگ کے لیے بھرتی ہونے پر آمادہ بھی کیا جاتا۔

بستیوں کے بھولے بھالے سیدھے سادے جوانوں کو مولویوں، پنڈتوں کی ترغیب اور جاگیرداروں کا دباؤ جنگ کے بہاؤ میں لے جاتا تھا۔ انگریز سرکار کی اس دلالی پر ان دلالوں کو مال اور اراضی رشوت میں ملتی تھی۔ انہیں اس کام میں دلچسپی بھی نہیں تھی۔ اس محکمے میں ہندو اور سکھ بھی تھے۔ جلد ہی انہیں اسی تعصب کے باعث راولپنڈی میں تعینات کر دیا گیا۔ جہاں جنگ عظیم کے اختتام تک انھوں نے ناسازگار دفتری ماحول اور حالات کے باوجود ملازمت جاری رکھی۔

اس دوران ان کے ماموں اشفاق حسین گورداسپور کے ایک سکول میں پی ٹی ماسٹر کی ملازمت پر متمکن ہو چکے تھے۔ اپنے خاندان میں ان کی اگر کسی سے بنتی تھی تو وہ تھے ان کے ماموں اشفاق حسین، جو اُن کے ہمراہ اور ہمنوا رہے۔ دونوں کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ اس لیے ماموں بھانجے کے رشتے کے باوجود دوستی کا رشتہ زیادہ گہرا تھا۔ دونوں میں بہت سے معاملات پر ذہنی وفکری ہم آہنگی تھی۔ جن دنوں وہ اپنے ماموں کے ہاں مقیم تھے انھیں دنوں ان کی ممتاز مفتی سے پہلی ملاقات ہوئی۔ ممتاز مفتی ایک مشہور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ یہاں کے ایک سکول میں ماسٹر تھے۔ اشفاق حسین کے ہمسائے میں رہتے تھے۔ ان کی اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا اور ممتاز مفتی اپنے اکلوتے بیٹے (عکسی مفتی) کو خود سنبھالتے تھے۔ مفتی ہر شام اشفاق کے ہاں آ جاتے۔ جہاں ہر شام گانے کی محفل ہوتی تھی۔ یہیں احمد بشیر کو ممتاز مفتی سے خاص تعلق خاطر ہو گیا جو تادمِ واپسیں قائم رہا۔ احمد بشیر عمر میں ان سے پندرہ سولہ سال چھوٹے تھے مگر ان کے درمیان 'تو اور تم' کا انداز تکلم ان کی ایک دوسرے کے ساتھ قربت دلی اور بے تکلفی کا پتہ دیتا ہے)۔ ممتاز مفتی ان سے اپنی پہلی ملاقات کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> "۱۹۴۴ میں جب احمد بشیر پہلی مرتبہ مجھ سے ملا تو نیا نویلا' ہرا کچور' نوجوان تھا۔ خوش شکل، شوخ، رنگین، لاابالی بے پرواشکل وصورت دیکھتے تو صرف دوپٹے کی کسر تھی۔" (۷)

احمد بشیر اور مفتی کی رفاقت گورداسپور میں ایک ڈیڑھ ماہ ہی رہی۔ممتاز مفتی کو سکول ماسٹری ناپسند تھی انہیں لاہور ریڈیو سے بلاوا آ گیا اور احمد بشیر کو بھی اب نئی ملازمت تلاش کرنا تھی۔ چنانچہ دونوں اکٹھے لاہور آ گئے۔ان دنوں لاہور میں ممتاز مفتی کی شہرت عورتوں کی نفسیات پر انوکھے افسانے لکھنے والے افسانہ نگار کی تھی۔انہیں لاہور میں ملٹری اکاونٹس میں ایک کلرک کی ملازمت مل گئی یہاں مشہور شاعر عبدالحمید عدم ان کے افسر تھے۔تنخواہ نہ ملنے کے باعث دیگر کلرکوں کی آواز بلند کرنے کے نتیجے میں انہیں لاہور سے ٹرانسفر کر دیا گیا۔مگر وہ لاہور نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔سو یہ نوکری بھی گئی۔ریڈیو پر احمد بشیر اپنی فراغت کے باعث ممتاز مفتی کے ساتھ چلے جاتے۔یہیں ان کی نامور ادیبوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔دراصل ممتاز مفتی چاہتے تھے، بقول احمد بشیر، میں اپنے آپ کو پہچان لوں۔اسی دوران ممتاز مفتی نے ایک فلم کی کہانی لکھی جو کہ پروڈیوسر کو پسند آ گئی اور اس نے ممتاز مفتی کو بمبئی آنے کے لیے کہا۔انھوں نے احمد بشیر کو بھی تیار کیا اور دونوں بمبئی چلے گئے۔کہانی کی رقم وصول کرنے کے بعد دونوں واپس لاہور آ گئے۔اس کے بعد انہیں شیخوپورہ میں کلاتھ انسپکٹر کی ملازمت مل گئی۔یہ بڑے مزے کی نوکری تھی، بس انہیں ہر ماہ شیخوپورہ جا کر تنخواہ لینا ہوتی۔اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انہیں کوئی کام نہیں تھا۔دراصل ان کا افسر بڑا زیرک آدمی تھا۔اس نے احمد بشیر کی طبیعت بھانپ لی تھی۔اسے پتہ تھا کہ یہ سر پھرا نوجوان اسے محکمے کے مالی معاملات میں خورد برد نہیں کرنے دے گا۔اس لیے انہیں لاہور رہنے کی چھوٹ دے کر اس نے اپنا کام آسان کر لیا تھا۔اب اسے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ادھر احمد بشیر بھی لاہور میں دوستوں کے ساتھ رہ کر اور نئے نئے ادیبوں سے مل کر خوش تھے۔

ان دنوں کلکتہ اور بمبئی کے بعد لاہور میں بھی چھ فلم سٹوڈیوز تھے جہاں ہمہ وقت فلمبندی کا کام جاری رہتا تھا اور یہاں کے بیس سینما گھروں میں، کلکتہ اور بمبئی کے ساتھ ساتھ لاہور کی فلموں کی بھی نمائش ہوتی تھی۔لاہور سے انگریزی اور اردو زبان میں بیس سے زائد فلمی رسائل و جرائد شائع ہوتے تھے۔چنانچہ لاہور میں ممتاز مفتی کے دوست، مکتبہ اردو لاہور کے مالک چودھری برکت علی نے بمبئی سے ایک فلمی میگزین ''فلمان'' جاری کرنے کا پروگرام بنایا۔اس سلسلے میں انھوں نے ممتاز مفتی کو اس کی ادارت کے لیے بمبئی بھیجنے اور وہاں کرشن چندر کے ہاں ٹھہرنے کا بھی انتظام کر دیا۔جب ممتاز مفتی نے اپنے اس پروگرام سے انہیں آگاہ کیا اور ساتھ چلنے کی دعوت دی تو ان کا خیال تھا کہ بمبئی میں رسالے کی تیاری کے ساتھ ساتھ وہاں کی فلم انڈسٹری میں شاید انہیں بطور اداکار کوئی کام ہی مل جائے گا۔دراصل نوجوانی کے زمانے میں انہیں بھی فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا۔مگر یہ اس قدر شدید نہ تھا کہ وہ سب

کچھ ترک کر کے فلم نگر میں جا ڈیرے ڈالتے۔ لیکن اب جو انہیں موقع ملا تو ان کے ذہن میں فلم لائن میں قسمت آزمائی کا سودا سمایا ہوا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ملازمت سے چھٹی لینا بھی کار زیاں ہی سمجھا اور جھٹ سے بمبئی جانے کو تیار ہو گئے۔ یہ ۱۹۴۷ء کے اوائل کا زمانہ تھا۔ جب ہندوستان کے بیشتر لکھنے والے بمبئی پہنچ چکے تھے۔ جو بھی بمبئی جاتا کرشن چندر کے گھر (کوورلاج) کا رخ کرتا۔ کرشن چندر کے مکان نے خیراتی سرائے کی سی شہرت اختیار کر لی تھی۔ یہ گھر بمبئی کے مضافات میں وکٹوریہ ٹرمنس سے ستر ہ اسٹیشن اندھیری کے ساحل پر واقع تھا۔ ان دنوں حمید اختر بھی بمبئی فلم انڈسٹری سے وابستہ تھے۔ (ساحر کے ایک دوست بلونت رائے نے تحریک خلافت سے لے کر ۱۹۴۷ء تک آزادی کی جدوجہد پر ایک فلم ''آزادی کی راہ پر'' بنانے کا اعلان کیا تو ساحر، حمید اختر کو لے کر بمبئی آ گیا۔ (یہ فلم تقسیم ہند کے خلاف تھی مگر تاخیر کے باعث پاکستان بننے کے بعد ریلیز ہوئی اور بری طرح فلاپ ہوئی۔ یہ پہلی فلم تھی جس کے سب گانے ساحر نے لکھے۔ اس فلم میں حمید اختر نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا)۔ حمید اختر ان دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین کے روح رواں سید سجاد ظہیر کے ہاں فروکش تھے اور انجمن کی بمبئی شاخ کے سیکریٹری بھی تھے۔ چودھری برکت علی نے کرشن چندر کو ممتاز مفتی اور احمد بشیر کی آمد سے مطلع کر دیا تھا۔ چنانچہ دونوں سیدھے کرشن چندر کے ہاں پہنچے۔ کرشن چندر کے ہاں ہی احمد بشیر کی پہلی ملاقات حمید اختر، میراجی، وشوامتر عادل، ساحر لدھیانوی اور ادا کار آغا طالش سے ہوئی۔

بمبئی میں قیام کے دوران وہ دوست احباب، دانشوروں فلم ایکٹرسوں ڈائریکٹروں اور پروڈیوسروں سے میل ملاقات اور میگزین کی منصوبہ بندی اور ابتدائی تیاری ہی کر سکے۔ کیونکہ رسالے کے لیے اور دیگر اخراجات کے لیے روپے کی ضرورت تھی مگر ان دنوں اچانک لاہور سے پیسے بھیجنے پر پابندی لگ گئی۔ جس کے لیے ممتاز مفتی کو پیسے لینے کے لیے لاہور آنا پڑا مگر اسی دوران تقسیم ہند کا لمحہ آ گیا اور ہر طرف آگ اور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ مغربی پنجاب میں ہندو سکھ اور مشرقی پنجاب اور شمالی ہند میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہونے لگا۔ ان خون آشام فسادات نے سب کچھ تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ احمد بشیر بمبئی میں اکیلے رہ گئے۔ جب حالات کچھ بہتر ہوئے تو وہ بذریعہ ریل ستمبر ۱۹۴۷ء میں لاہور پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر دونوں (ممتاز مفتی اور احمد بشیر) نے کرشن نگر کے علاقے میں ایک مکان الاٹ کروالیا جس کی پیشانی پر ''اولی لاج'' لکھا ہوا تھا اور یہاں روزگار کی تلاش کا سلسلہ آغاز ہوا۔ کراچی جانے سے پہلے بھی وہ کرشن نگر میں رہتے تھے۔ ''اولی لاج'' کے بارے میں عکسی مفتی نے دوران گفتگو بتایا:

''جب تقسیم کے بعد احمد بشیر اور ممتاز مفتی لاہور باہم ہوئے تو یہ بہت بے کسی اور

کسمپرسی کا دور تھا۔ سر چھپانے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ ہندو رخصت ہو رہے
تھے اور ان کے مکانوں سے سامان نکال کر سرکار تالے لگا رہی تھی۔ اسی طرح کا
ایک مکان جس کی پیشانی پر''لولی لاج'' لکھا ہوا تھا احمد بشیر نے بہت دلیری سے
اس مکان کا تالا توڑا اور حمد بشیر اور ہم یعنی میں (عکسی مفتی) میرا سوتیلا بھائی قیس
مفتی اور میری سوتیلی والدہ اقبال بیگم ایک ساتھ رہنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد احمد بشیر
نے اپنے خاندان کو بھی ایمن آباد سے لاہور بلا لیا۔ اس مکان میں رہنے لگے۔''

بمبئی جانے اور تقسیم کی وجہ سے شروع ہونے والے ہنگاموں کے باعث ان کی کلاتھ انسپکٹری کی نوکری بظاہر ختم ہو چکی تھی مگر تقسیم کے عمل کے بعد اس کی یہ نوکری بحال بھی ہوگئی اور سابقہ مہینوں کی تنخواہ بھی مل گئی اور تبادلہ بھی شاہدرہ، لاہور کے قریب ہی ہو گیا۔ مگر چند ماہ بعد یہ نوکری چھوڑ دی۔ بقول ممتاز مفتی، انہیں اس نوکری میں اپنی ایمن آباد والی شیخ برادری کی بو آتی تھی۔ نوکری چھوڑنے کی مفصل وجہ انھوں نے ''دل بھٹکے گا '' میں ان لفظوں میں بیان کی ہے۔

''رات کو جمال نے رجسٹر کھولا تو اس میں سو سو روپے کے نوٹوں کی ایک گڈی رکھی تھی۔ پورے سولہ سو روپے۔ جمال کو ڈپو ہولڈر کی حماقت پر بڑا رحم آیا کہ بیوقوف اپنے نوٹ رجسٹر ہی میں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ وہ اسی وقت ڈپو ہولڈر کے گھر گیا۔ حساب کتاب ٹھیک ہے نا سرکار؟ اس نے ہنس کر پوچھا۔ جمال نے کہا حساب تو میں نے دیکھا نہیں، مگر تم رجسٹر میں کچھ نوٹ چھوڑ آئے ہو۔ احتیاط کرنی چاہئے میاں!

احتیاط کی ہے جی۔ ڈپو ہولڈر بولا۔ آٹھ ہزار کے کپڑے پر آپ کے سولہ سو ہی بنتے ہیں۔ بیس فیصد کے حساب سے۔۔۔

یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔

جناب افسروں سے بے ایمانی ہمارا اصول نہیں۔ ڈپو ہولڈر بولا۔ ہم افسروں کا حصہ پہلے اور برابر نکال دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔

مگر رات کو جمال کو دیر تک نیند نہ آئی۔ کوئی اس کے کان میں یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اگر چہ تم ان سولہ سو روپوں سے بہت کچھ کر سکتے ہو۔ نئی بائیسکل خرید سکتے ہو نئے کپڑے بنوا سکتے ہو اور روزانہ سینما دیکھ سکتے ہو مگر یہ بات ٹھیک نہیں۔ صبح

سویرے اٹھ کر جمال نے کپڑے بدلے۔ روپے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھے۔ سوٹ کیس، گھی کا کنستر اور انڈوں کی ٹوکری ساتھ لے کر وہ لاہور بھاگ گیا ہمیشہ کے لیے۔۔۔۔!!"

شادی

احمد بشیر کی شادی ان کے والدین نے نوجوانی ہی میں اپنے خاندان کی ایک لڑکی سے کر دی تھی۔ یہ لڑکی جو بالکل ان پڑھ تھی ان کے گھر ہی میں رہتی تھی اور ان کی والدہ ممتاز بیگم سے بے حد متاثر تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی زندگی کا قرینہ بھی ممتاز بیگم ہی سے سیکھا تھا اور وہ بالکل ان جیسی ہی ہو گئی تھی۔ اس وقت احمد بشیر کی عمر غالباً بیس سال تھی جب کہ اس خاتون کی عمر ان سے کوئی چار پانچ سال زیادہ ہوگی۔ رشتے میں وہ ان کی پھوپھی تھی کیونکہ وہ خاتون ان کے والد کی چچازاد بہن تھی۔ دراصل شیخ غلام حسین دو سال کی عمر میں حصارِ یتیمی میں آ گئے تھے۔ ان کی پرورش ان کے اسی چچا نے کی۔ چنانچہ جب ان کے چچا نے اپنی بیٹی احمد بشیر کے ساتھ بیاہنے کی خواہش ظاہر کی تو شیخ غلام حسین نے اسے حکم سمجھ کر اس کی تعمیل کی بلکہ تعمیل کروائی۔ مگر احمد بشیر ذہنی طور پر اسے بیوی سمجھنے سے قاصر تھے۔ یہ ایک نفسیاتی سا مسئلہ تھا۔ ایک دفعہ ممتاز مفتی نے پوچھا کہ وہ اپنی بیوی کے پاس کیوں نہیں جاتا۔ احمد بشیر نے جواب دیا۔ "میں اسے بیوی سمجھتا ہی نہیں چنانچہ میں جب بھی اس کے پاس جاتا ہوں مجھے یوں لگتا ہے جیسے اپنی ماں کے پاس جا رہا ہوں۔" والدین کا اس شادی کو جاری رکھنے کے لیے شدید دباؤ تھا۔ مگر احمد بشیر کی افتادِ طبع اطاعت کے اس درجے سے کسی اور طرف نکل چکی تھی۔ آخر کار وہ احتجاج کے طور پر گھر سے رخصت ہو کر لاہور شہر آ گئے۔ ممتاز مفتی کے ساتھ پہلے ہی ان کی بہت گاڑھی چھنتی تھی۔ اس سلسلے میں ممتاز مفتی اور ان کے دوست ماموں اشفاق حسین نے ان کا بھرپور ساتھ دیا اور انہیں اس بے جوڑ بندھن سے نجات دلائی۔ مفتی کہتے ہیں۔ "ہم دونوں نے مل کر ایک محاذ کھول لیا۔ ایمن آباد میں ایک طوفان آ گیا۔ وہ دھول اڑی۔ بالآخر ہم احمد بشیر کی روایتی طور پر دوسری شادی کروانے میں کامیاب ہو گئے۔" بلکہ وہ یک جان دو قالب تھے چنانچہ ممتاز مفتی نے انہیں بکھرنے سے بچانے کا سامان کیا۔ قیاس ہے کہ احمد بشیر کی شادی ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء کے دوران میں ہوئی۔ بقول نیلم احمد بشیر، شادی کے سال اور تاریخ اور شادی کے وقت ابا کی عمر کے حوالے سے کوئی بات نہ ہوئی یا ہو نہ سکی" اور اس ساری بحث سے مذکورہ بالا، ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۰ء کے دورانیہ کو ہی ان کی شادی کے سالوں میں شمار کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے (۸)۔

اپنی اس شادی کے بعد وہ اپنے والدین سے بہت زیادہ نالاں رہنے لگے تھے۔اس شادی کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان کے والدین نے ان پر ظلم کیا ہے۔ پروین بتاتی ہیں کہ جب بھائی جان کی شادی ہوئی اس وقت ہماری والدہ بھی جوان تھیں۔(ہماری امی اور بھائی کی عمر میں پندرہ سال کا فرق تھا۔جس کا مطلب ہے کہ امی کی شادی چودہ سال کی عمر میں ہوئی۔اور بھائی جان ان کے پہلوٹھی کے بیٹے تھے)۔ بھائی جان کی شادی کے دن انھوں نے سرخ رنگ کا جوڑا پہنا ہوا تھا اور وہ بنی ٹھنی بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔ بھائی جان نے ان کو دیکھ کر جلے ہوئے لہجے میں کہا۔میرے خون میں رنگا ہوا جوڑا پہن کر میری ماں کتنی خوش ہے۔''احمد بشیر کا اس زبردستی کی شادی پر احتجاجی جملہ مگر طوعاً و کرہاً شادی کے لیے رضامند ہونا اور پھر ان کا وقت کے ساتھ ساتھ کوشش کے باوجود اس شادی کو نبھانے سے معذوری ان کے اندر کے انسان کے ان خدوخال کو تشکیل دیتی محسوس ہوتی ہے جو ان کی آئندہ زندگی میں ان کی پہچان بنے۔ بہرحال جب وہ اس خاتون کے ساتھ نہ چل سکے تو انھوں نے بغاوت کردی اور لاہور آ گئے۔اس سلسلے میں ان کے خودنوشت سوانح حیات نما ناول ''دل بھٹکے گا'' سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے، جو اس دور کے منظرنامے کو پیش کرتا ہے۔

''جمال کی زندگی میں بڑے گھاؤ تھے۔وہ والدین سے سخت ڈرتا تھا۔وہ اسکی جس خاندانی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے وہ اسے پسند نہ تھی۔اصل میں وہ ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار ہی نہیں تھا اور اب وہ بے روزگار بھی تھا۔یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کے ابا اس سے پوچھیں کہ تم نے جنگ کیوں ختم ہونے دی جب تمہیں پتہ تھا کہ تمہاری نوکری اس کی وجہ سے ہے۔مفتی نے کہا۔شادی سے انکار کردو۔میرا باپ مجھے مار ڈالے گا۔جمال بولا،وہ بہت کمزور آدمی ہے رشتہ داروں سے بہت ڈرتا ہے۔میرے ماں باپ بہن بھائی مجھ سے سب چھوٹ جائیں، پھر کیونکہ لڑکی ہماری قریبی عزیزہ ہے۔سب چھوٹ جائیں گے۔ چھوٹ جائیں پھر؟مفتی نے کہا۔ہمارے گھرانے میں دکھ پھیل جائے گا۔سب کی بےعزتی ہوجائے گی۔ہوجائے!میری ماں پہلے ہی مجھ سے نفرت کرتی ہے وہ کبھی میری صورت نہ دیکھے گی۔نہ دیکھے۔میں نور پور کبھی نہیں جا سکوں گا۔سب مجھے آوارہ بدکردار اور بےشرم سمجھیں گے۔سو ہاٹ!۔''(۹)

کھل کر جینے کی راہ انھیں ممتاز مفتی نے سو ہاٹ کے فلسفے میں دکھائی۔پاکستان بننے کے کچھ

ہی عرصے بعد آہستہ آہستہ برف پگھلی اور ان کے والدین احمد بشیر کے فیصلے کے آگے ڈھیر ہو گئے۔ انھوں نے اپنی پہلی بیوی نذیر بیگم کو طلاق دے دی اور ان کے والد نے اس کا نکاح خاندان میں کسی اور جگہ کر دیا۔ جہاں پر اپنے بچوں کے ساتھ خوش باش اور خوشحال زندگی گزار رہی ہے۔ بہر حال شیخ غلام حسین کو ساری زندگی اس بات کا ملال رہا۔ چنانچہ باپ بیٹے، بلکہ والدین کے ساتھ ان کے سرد تعلقات کی یہ وجہ زندگی بھر قائم رہی۔

شیخ برادری ہی میں ان کے عقد ثانی کا اہتمام کیا گیا۔ احمد بشیر کے سسر شیخ عبدالمجید کا تعلق گجرات سے تھا۔ وہ ریلوے میں افسر تھے اور بسلسلہ ملازمت ملتان میں تعینات تھے۔ ان کی ساس کا نام اقبال بیگم تھا۔ احمد بشیر کے خاندان کی نسبت ان کا سسرالی گھرانہ لبرل اور زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ ان کی اہلیہ محمودہ بیگم اپنے دولہا پیا کے ساتھ بارات سے آغاز ہونے والے سفر کا منظر یوں بیان کرتی ہیں:

> ''ایمن آباد میرے اباجی کی خالہ کا گاؤں تھا۔ ہم لوگ شادی بیاہ کے موقع پر اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔ اباجی کی کزن کی دو بہنیں، اقبال اور ممتاز تھیں۔ اقبال ہی مسرت نذیر کے شوہر ارشد کی امی تھیں۔ دو کزن بھائی تھے اشفاق حسین اور ریاض حسین۔ ریاض جو ین ملتان میں کالونی مل میں نوکری پر لگ گئے اور ہمارے گھر آنے جانے لگے۔ انھوں نے ہی میرے اباجی کو بتایا کہ انکی بہن آپا ممتاز کا بیٹا احمد بشیر بہت خوبصورت چھیل چھبیلا لڑکا نکلا ہے۔ وہ بمبئی میں ممتاز مفتی کے ساتھ اخبار نکال رہا تھا کہ بنوارا ہو گیا۔ اور وہ واپس ایمن آباد آ گیا ہے۔۔۔ ماموں ریاض نے احمد بشیر کی تعریفیں کرنا شروع کر دیں اور پھر یہ بھی بتایا کہ احمد بشیر کے ماں باپ نے اس کی زبردستی شادی کر دی تھی ۔۔۔ شادی ایک سال چلی اور پھر ۔۔ طلاق ہو گئی ۔۔۔ احمد بشیر اپنے ماموں کے ساتھ ہمارے گھر پر دکھاوے کے لیے آئے۔ خوبصورت تھے لہٰذا میرے اباجی کو فوراً پسند آ گئے ۔۔۔ احمد بشیر کے ماں باپ بھی رضامند ہو گئے ۔۔۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۴۸ء ہماری شادی ہو گئی ۔۔ دولہا نے کالا سوٹ اور پر فلیٹ ہیٹ پہن رکھی تھی۔ سہرے کی چار لڑیاں سجا کر اپنے باراتی۔ ممتاز مفتی اور قریبی دوست سرسید سکول والے نذیر قیصر، اپنے ماموں اشفاق اور جمیل بھائی، اختر عکسی اور والد کے ساتھ مختصر سی بارات کے ساتھ آ گئے'' (۱۰)

شادی کے بعد کی زندگی کے بارے میں ایک شذرے میں محمودہ بیگم اپنے شوہر کے ساتھ اپنی زندگی کے سفر کی روداد یوں بیان کرتی ہیں۔

"جس نے شادی کے دوسرے دن برقعہ اتروا دیا۔ میں نے اتار دیا۔ اس کے بعد جس رنگ میں رنگتے گئے وہی ہوتی گئی۔ زیادہ تعلیم نہ تھی۔ مگر ابن انشا اور ممتاز مفتی کی سنگت میں کافی سیکھ گئی۔ ایک سیدھی سادی لڑکی تھی نہ نفسیات کا علم نہ سوشلزم کا پتہ مگر ماحول نے سب کچھ سمجھا دیا۔ مجھے گانے کا شوق تھا، فلمیں دیکھنے کا شوق تھا۔ مجھے کہا۔ جاؤ ریڈیو پاکستان پر گانا گاؤ۔ ابن انشاء کے ساتھ فلم دیکھ آؤ۔ اتنا لبرل کھلے دماغ کا آدمی جو اپنی جوان بیوی کو استاد رکھ کر گانا سکھاتا۔۔ یہ احمد بشیر کے سوا کون کر سکتا ہے۔ اندر سے ایک معصوم بچہ تھا۔ جوٹی وی کا فضول ڈرامہ دیکھ کر آنسو بہانے لگتا۔ ویسے ضدی، اپنی مرضی کے مالک، سچے انسان تھے۔ اسی وجہ سے ہمیشہ تکلیف میں رہے۔ دو سال کی نیلم کو لے کر کراچی ریڈیو پاکستان کی سکرپٹ رائٹر کی نوکری کو نکل پڑے۔ مگر چند ماہ بعد زیڈ اے بخاری سے لڑائی کر کے بے کار ہو گئے۔ پھر ایک امیر رشتے دار کا سامان لے کر گدھا گاڑی پر بھی سواری کی۔ میں ساتھ ساتھ بغیر تنخواہ گھر کو چلاتی رہی۔ نہ شکوہ کیا نہ رونا مچایا صرف خوشی محبت اور وفاداری کے سہارے زندگی گزارتی رہی۔ اسی کراچی میں سندھ گورنمنٹ میں انفرمیشن آفیسر بنے۔ انکا انداز انوکھا ہر چیز عام لوگوں سے مختلف تھی۔۔۔۔۔۔۔
ابن انشاء نے جنگ میں کالم لکھا میرا دوست احمد بشیر مکان بدلتا ہے تو بھابی سے کہتا ہے، مجھے نئے گھر کا ایڈریس لکھا دو میں وہیں آجاؤں گا۔ بشریٰ پیدا ہوئی تو میں روئی کہ تین بیٹیاں ہو گئیں۔ کہنے لگے او ہو، یہ تو میری گوپی آگئی ہے۔ میں نے بہت خوبصورت زندگی گزار دی۔ ہر بات مانتی تھی چاہے اچھی لگے نہ لگے۔ یہی خوشی کا راز تھا۔ وہ میرے بہت وفادار محبت کرنے والے خاوند تھے۔ نیلا پربت کے دوران ایکٹرسوں کو شکایت تھی کیسا بور ڈائریکٹر ہے۔ بنی بنی کہتا ہے۔ وہ میرے محتاج تھے پہلے دن سے ان کا ہر کام کرتی تھی۔ اپنی فیملی والوں کے لیے محبت کا سمندر تھا ان کے دل میں۔ اب میں اکیلی زندگی گزار رہی ہوں اچھا ہوا وہ پہلے چلے گئے ورنہ اگر میں پہلے جاتی تو ان کے لاڈ کون اٹھاتا۔" (۱۱)

احمد بشیر نے سرکاری ملازمت سے پہلے اور بعد میں کاروبار اور مزدوری کے مختلف مراحل دیکھے۔ اسی سلسلے میں انہیں کلکتہ، دہلی، پونا وغیرہ جانے کا موقع ملا۔ مگر ان کی اصل ملازمت کا آغاز صحافت سے ہوا۔ روزنامہ امروز میں ان کی اور مولانا چراغ حسن حسرت میں گاڑھی چھنتی تھی۔ مولانا کی جوہر شناس نظروں کو احمد بشیر کا بے باک ہونا اور صاف گو اور ہمدرد ہونا بھا گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد انہیں امروز سے علیحدہ کر دیا گیا۔ جس کے بعد انھوں نے ایک اور مقامی پرچے میں ملازمت کر لی مگر اپنی صاف طبعی کے باعث یہاں بھی نہ ٹھہر پائے بالآخر دوبارہ امروز سے بطور کالم نگار وابستہ ہو گئے۔ چند سال کے بعد جب چراغ حسن حسرت کی میاں افتخار الدین سے ان بن ہوئی تو چراغ حسن حسرت کے ساتھ وہ بھی امروز سے علیحدہ ہو گئے۔ پھر جب چراغ حسن حسرت کو ریڈیو پاکستان کراچی پر ایک قومی پروگرام کے سکرپٹ رائٹر کی پیشکش ہوئی تو انھوں نے تار دے کر احمد بشیر کو کراچی بلا لیا۔ اور دونوں نے وہاں سکرپٹ رائٹرز کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ مگر مولانا کو ریڈیو پر لکھنے کا تجربہ نہیں تھا۔ اسی طرح احمد بشیر گو اخبار میں فیچر رائٹنگ کے بانی تھے مگر ریڈیو اور اخبار کے فیچر میں فرق ہوتا ہے۔ دراصل ریڈیو، ٹیلی ویژن کے لیے لکھنے والے رائٹر کو اپنا انداز اور اسلوب ترک کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں استاد اور شاگرد لکھے ہوئے لفظ اور بولنے والے لفظ کے فرق کو نہ سمجھ سکے اور اس پر مستزاد زیڈ اے بخاری کا وہ رویہ جو ان کی لیاقت اور شان کے شایاں نہ تھا اس لیے احمد بشیر جلد ہی یہاں سے فارغ ہو گئے۔ اب کراچی تھا اور ان کی بے روزگاری۔ اس دوران انھوں نے اپنے بیوی بچوں کے سر چھپانے کے لیے گولیمار کے ایک چھپرے میں پناہ لی۔ اس زمانے میں گولیمار، لالوکھیت ایک ویرانہ تھا جو ندی کے کنارے حکومت نے اس ویرانے میں غریب مہاجروں کے لیے چھپر بنوا رکھے تھے۔ یہیں احمد بشیر کی بیوی مودی ایک فلاحی انجمن کے لیے سلائی کا کام کرتی اور گھر چلاتی تھی۔ اس وقت ان کے ہاں ایک بیٹی نیلم پیدا ہو چکی تھی۔ احمد بشیر سارا دن روزگار کی تلاش میں سڑکوں اور دفاتر میں پھرتے رہتے۔ آخر انہیں ایک موٹر کمپنی میں نوکری مل گئی۔ اس نوکری میں ان کا کام ٹرک سے مال اتار کر اسے گدھا گاڑی پر لاد کر ریلوے سٹیشن پر لے جانا ہوتا تھا۔ یوں احمد بشیر کئی مہینے کراچی کی سڑکوں پر گدھا گاڑی بھی چلاتے رہے۔ پھر مقدر نے یاوری کی اور انہیں سندھ گورنمنٹ کے انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں پہلے ایڈ ہاک پر اور پھر پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو میں کامیاب ہونے پر مستقل انفارمیشن آفیسر کی ملازمت مل گئی۔ کچھ عرصے بعد امریکی امدادی پروگرام کے تحت مرکزی حکومت میں ولیج ایڈ کا شعبہ قائم ہوا تو ابوالاثر حفیظ جالندھری نے صوبائی حکومت سے احمد بشیر کی خدمات مذکورہ محکمے کے لیے مانگ لیں۔ چنانچہ احمد بشیر اب ڈیپوٹیشن پر ولیج ایڈ میں آ گئے۔ اور زندگی پھر سے لہلہانے لگی۔ ابو

الاثر حفیظ جالندھری ڈائریکٹر تھے جبکہ احمد بشیر ان کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ انھوں نے ممتاز مفتی کو خط لکھ کر کراچی بلا لیا۔ وہ ان دنوں ملازمت کے لیے پریشان تھے۔ کراچی میں انہیں ولیج ایڈ ہی میں سکرپٹ رائٹر کی ملازمت مل گئی کیونکہ ولیج ایڈ کے منصوبے میں دیہات کی ترقی کے لیے فلمیں بنانا بھی شامل تھا۔ اس کے علاوہ ولیج ایڈ کو ایک ماہوار پرچہ بھی جاری کرنا تھا اس کے لیے ایڈیٹر کی بھی ضرورت تھی، جس کے لیے احمد بشیر نے ابن انشاء کی سفارش کی۔ یوں یہ تین نابغہ ہائے عصر ایک عظیم شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری کے چھتنار سائے میں آن بیٹھے۔ ابن انشاء کی ادارت میں اس پراجیکٹ کے زیر انتظام پرچہ "پاک سر زمین" کے نام سے نکلنا شروع ہوا۔ کیونکہ احمد بشیر ابولاثر حفیظ جالندھری کے نائب ہونے کے باعث ابن انشاء اور ممتاز مفتی ان کے اسسٹنٹ تھے اور وہ "ولیج ایڈ" کے تمام کاموں کے نگران تھے۔ اس لیے پرچے کی چھپائی کے سلسلے میں وہ اکثر پریس میں جاتے رہتے تھے۔ اپنی غریب طبیعت کے باعث اکثر وہ وہاں کے مزدوروں میں گھل مل کر بیٹھتے اور ان سے باتیں کرتے۔ اس لیے پریس کے ملازمین اور مزدوران کی بہت عزت کرتے تھے۔ ایک دن ریڈیو پر کلاسیکی موسیقی نشر ہو رہی تھی۔ احمد بشیر اس وقت مزدوروں کی ٹولی میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ریڈیو پر بجنے والے پکے راگ کے جواب میں ایک مزدور کے منہ سے جوابی تان نکل گئی۔ یہ مزدور یہاں پیٹیاں اٹھاتا تھا۔ احمد بشیر نے اس ادھیڑ عمر مزدور کو حیرانی سے دیکھا۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس مزدور کا نام قادر خان تھا اور ہندوستان میں وہ استاد جھنڈے خان اور استاد ولایت خان سے موسیقی کی تعلیم حاصل کر کے پیارنگ کے نام سے معروف تھا مگر پاکستان میں آ کر دو وقت کی روٹی سے محتاج مزدوری کرنے پر مجبور تھا۔ احمد بشیر نے بڑے ڈرامائی انداز میں اسے مزدوری سے چھٹی کروا دی، جس پر وہ رونے لگا اور منتیں کرنے لگا۔ احمد بشیر اسے اپنے دفتر میں لے گئے اور سٹینو کو بلا کر اسے بارمونیم ماسٹر کا تقرر نامہ ٹائپ کر کے لانے کو کہا اور اس کی عزت و توقیر کی۔ ستار نواز عنایت خان کو جو کہ گلیوں میں گھوم پھر کر رنگ بیچتا اور روزگار کماتا تھا، اسے انھوں نے اپنے بھائی اختر عکسی کو کہہ کر لاہور سے کراچی بلوا کر ملازمت پر لگوا دیا اس کے بعد قادر خاں عرف پیارنگ ایک طبلہ نواز محمود کو لے آیا۔ یوں ولیج ایڈ میں موسیقی کا شعبہ مکمل ہو گیا۔ اسی محکمے میں امریکن ایڈ پروگرام کے تحت انہیں ایک سال کے لیے امریکہ فلم میکنگ اکیڈمی میں کورس کرنے بھیج دیا گیا۔ جہاں انھوں نے فلم میکنگ کی تربیت کے ساتھ ساتھ وہاں کی طرز معاشرت کا بھی مطالعہ کیا اور ہالی وڈ کے فلمستان کا بھی دورہ کیا۔ ابھی برازیل جا کر فلم میکنگ کا عملی تجربہ حاصل کرنا تھا مگر ابوالاثر نے چٹھی لکھی کہ یہاں کراچی میں کام رکے پڑے ہیں۔ لہٰذا وہ سال بھر میں یہ کورس کر کے تعریفی سند کے ساتھ واپس آ گئے۔ واپس آتے ہوئے انھوں نے نیویارک، کوپن ہیگن اور

ہیمبرگ میں بھی کچھ دن قیام کیا۔ واپس آئے تو ملک میں مارشل لاء آچکا تھا۔ دوسری طرف امریکی ماہرین نے نئی حکومت کے آنے بعد قرار دیا کہ ولیج ایڈ کا محکمہ مطلوبہ نتائج نہیں دے پا رہا۔ ان کا تبادلہ محکمہ فلم ومطبوعات میں کر دیا گیا۔ یہ ادارہ صرف ایسے گھسے پٹے موضوعات پر فلمیں بناتا تھا جن کا مقصد ایوب خان کی حکومت کے دور کی ترقی کی تشہیر تھا۔ انھوں نے حسب کتاب میں جانچ کی تو پتہ چلا کہ پروڈیوسر سٹوڈیو والوں کو زیادہ ادائیگی کروا کر ان سے کمیشن اینٹھتے ہیں۔ اس صورت حال سے زچ ہو کر انھوں نے چند ہفتوں کی چھٹی لی اور لاہور آکر اپنے دیگر کام نمٹانے لگے۔

یہ انیس سو ساٹھ کی بات ہے۔ بھائی کی موت کے بعد وہ جب کراچی آئے تو پتہ چلا کہ ان کی خدمات دوبارہ سندھ گورنمنٹ کے سپرد کر دی گئی ہیں اور ان کا تبادلہ محکمہ اطلاعات میں ہو چکا ہے۔ ان کی پوسٹنگ حیدرآباد میں ہوئی۔ انھوں نے سوچا کہ وہ پاکستان کے واحد تربیت یافتہ فلم پروڈیوسر ہیں مگر ابھی تک ان کی صلاحیتوں سے استفادہ ہی نہیں کیا گیا۔ کیوں نہ خود ہی فلم بنا کر اس شعبے میں اپنی مہارت اور تعلیم کا حق ادا کروں۔ اس پر ان کی بہن پروین نے سرمائے کی پیشکش کر کے بلکہ اصرار کر کے ان کے اس ارادے کو قابل عمل بنا دیا۔ پہلے تو انھوں نے بہن، بہنوئی کی کمائی سے اپنے شوق کی تکمیل کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر پیاری بہن پروین اور اس کے شوہر عاطف نے اصرار کیا تو انھوں نے اپنے محکمے سے چار ماہ کی رخصت لے لی اور فلم کی تیاری کا کام شروع ہو گیا۔ یہ فلم بری طرح فلاپ ہوئی۔ اس فلم کے بارے میں آئندہ سطور میں ذکر کیا جائے گا۔ اس فلم کی ناکامی نے انہیں اور بھی بہت سی ناکامیوں اور پریشانیوں سے متعارف کروایا۔ انھوں نے ستمبر ۶۵ء کی جنگ بھی اسی پریشانی اور تکلیف میں دیکھی ان دنوں وہ کراچی میں تھے جہاں سے لاہور وہ آ گئے اور جنگ کی وجہ سے وہ بہن پروین اور اپنے بچوں کو لے کر ایمن آباد اور پھر راولپنڈی میں ممتاز مفتی کے پاس رہے اور وہاں سے ایبٹ آباد کے قریب ایک ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔ لاہور واپسی پر بھی مالی حالت خراب ہی تھی اس پریشانی سے ان کے گھر کا خرچ والدین نے اپنے ذمے لیا ہوا تھا۔ ۱۹۶۹ء میں حالات اس وقت بدلے جب پھر سے روزنامہ امروز میں 'شہر سرائے' کے نام سے کالم لکھنا شروع کیا اور یہ سلسلہ ۱۹۷۰ء تک رہا۔ (۱۲)

فلم سازی (نیلا پربت)

احمد بشیر نے فلم میکنگ کی جو تربیت امریکہ کی مشہور یونیورسٹیوں سے حاصل کی تھی اس نے انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ انھوں نے تربیت کے دوران ہی فلم بنانے کا ذہن بنا لیا تھا۔ جس کا تذکرہ انھوں نے اپنے

خطوں میں اپنی بیگم مودی سے بھی کیا تھا۔(۱۳) انہیں اس بات کا زعم تھا کہ وہ پاکستان کے واحد ہدایتکار ہیں جو ہالی وڈ کے تربیت یافتہ ہیں۔ چنانچہ اس تربیت کا عملی مظاہرہ کر کے پاکستان کی فلم انڈسٹری میں انقلاب لانے کے بارے میں سوچنے لگے۔اسی سوچ نے اس وقت عملی شکل اختیار کی جب ان کی پیاری بہن، پروین نے بھائی کی خواہش کو بھانپ لیا۔ وہ بھائی جس نے ساری زندگی اپنی بہن کی خواہشوں کی نگہبانی کی تھی ۔اس بھائی کی خواہش کا احترام اور پاسبانی پروین عاطف نے اپنا فرض سمجھ کر کی اور اپنے سرمائے کی پیشکش کر دی۔ یوں ان کا خواب پورا ہونے کو آیا۔احمد بشیر نے نیلا پربت کے نام سے یہ فلم اپنے ادارے یوٹو پیا فلمز کے بینر تلے بنائی۔اس فلم کے پیش کار ایم اے خورشید تھے۔جبکہ اس کے فلمساز و ہدایتکار خود احمد بشیر تھے۔فلم کی کہانی اور مکالمے ممتاز مفتی نے لکھے۔ممتاز مفتی اس سے پہلے بھی ایک فلم کی کہانی لکھ چکے تھے۔ نیلا پربت کے اداکاروں میں محمد علی، حسنہ، کومل، کمال ایرانی، آغا جان، خورشید کنول، گوری، کامو، گوتم، پناّ (بعد میں زریں سلیمان) اور آغا طالش شامل تھے اور پس پردہ موسیقی، نور جہاں، روشن آراء بیگم، الطاف محمود، اثمارہ احمد کے نام شامل ہیں۔نغمہ نگاروں میں ظہور نظر، ابن انشاء، حفیظ جالندھری اور پیارنگ کے نام شامل ہیں۔اور اس فلم کی موسیقی کی ذمہ داری بھی پیارنگ نے نبھائی فوٹو گرافی ایم حسین، نسیم حسین اور نصرت بٹ نے کی اور آرٹ ڈائریکشن میں اقبال حسین، سرور اور نشان کے نام شامل ہیں۔تدوین (Editing) امان مرزا نے کی اور ریکارڈنگ حسن ضیاء اور ہاشم قریشی نے کی اور سٹل فوٹو گرافی خسرو نے کی، ڈانس کروانے والوں میں اتمش، حمید چودھری اور ماسٹر صدیق کے نام شامل ہیں۔ پروسیسنگ خواجہ رشید نے مکمل کی اور پروڈکشن کنٹرولر فرخ جمیل اور بشیر احمد تھے اور چیف اسسٹنٹ ارشد مرزا۔فلم میں معاونین کے نام یہ ہیں: کیمرہ اسسٹنٹ مسعود بھٹی، سعید کھوکھر، معاون تدوین، منور خان، ارشد مرزا، ماجد مرزا، پروسیسنگ اسسٹنٹ رمضان اور ریاض ہیں۔پروڈکشن اسسٹنٹ منور حسین، ارشد محمود کے نام شامل ہیں۔ (۱۴)''نیلا پربت'' میں انھوں نے اپنی دریافت ،استاد قادر خاں المعروف پیارنگ کو فلم کا موسیقار مقرر کیا۔ یہ فلم کراچی کے ایسٹرن سٹوڈیوز، لاہور کے باری اور شاہنور اسٹوڈیوز میں بنی۔سرمائے کی کمی کے باعث فلم کی شوٹنگ بار بار رک جاتی۔ یہ فلم کئی سال تک بنتی رہی۔اس دوران احمد بشیر کو ذہنی اذیت کے علاوہ شدید مالی مشکلات کا بھی سامنا رہا۔جس کا ذکر انھوں نے اپنے ناول کے علاوہ اپنے خطوط میں بھی کیا ہے۔اپنے منہ بولے بیٹے احمد مجید کو ایک خط میں لکھتے ہیں: ''فلم کا بہت برا حال ہے۔میرا حشر دیکھ لو۔۔۔فی الحال حالات خراب سے خراب تر ہیں۔فلم کا کہیں بھی کوئی گاہک نہیں اور روٹی کے لالے پڑے ہیں۔میں ذلت کی انتہا تک پہنچ گیا ہوں۔''ایک اور

خط میں مجید ہی کو لکھتے ہیں۔"فلم مکمل ہو چکی ہے۔کوئی خریدار نہیں۔ٹریلر ایسا بنایا ہے کہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔کوئی خریدار نہیں۔" وہ اپنی فلم کے بارے میں بہت پر امید تھے۔احمد مجید ہی کو اگلے خط میں لکھتے ہیں۔"فلم کو میں آجکل فائنل کر رہا ہوں۔اور اب میرا حوصلہ بڑھ گیا ہے۔اللہ کا فضل کیوں نہ شامل حال رہے گا۔کیونکہ میں اچھا آدمی ہوں اور فلم پر محنت اتنی کی ہے کہ کسی نے آج تک نہیں کی۔اصل میں میں طویل ناکامیوں سے کچھ دل شکستہ تھا۔مگر خدا کا شکر ہے کہ کام اپنی جگہ بہت مضبوط ہے۔گانے اپنی جگہ ڈالنے سے کہانی کی صورت اور ہی نکل آئی ہے۔ٹریلر میں نے بنالیا ہے اور ایسا تم نے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔پبلک کے ہوش گم ہو جائیں گے اور ڈائریکٹروں کے بھی۔یعنی اب پتہ چلے گا کہ ایڈیٹنگ اور ڈائریکشن کسے کہتے ہیں۔اگر اس میں سے کوئی ایک شاٹ لاکر دکھا دے تو میں غلام ہو جاؤں اور لطف یہ ہے کہ اس میں کوئی ٹائٹل نہیں اور بیک گراؤنڈ میوزک بھی نہیں۔(۱۵) غالباً سن انیس سو ستر میں یہ فلم نمائش کے لیے پیش کی گئی تو بری طرح فلاپ ہوئی۔اس فلم کے باکس آفس تک آنے سے پہلے اور نمائش کے لیے پیش کیے جانے اور ناکامی کی داستان بہت طویل ہے۔(تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے احمد بشیر کا ناول،دل بھٹکے گا)۔

فلم نیلا پربت کی ناکامی کی وجوہات:

فلمی ناقدین و ماہرین اور خود احمد بشیر نے اس فلم کی ناکامی کی جو وجوہات بیان کیں ان کا ملخص یہ ہے۔

۱۔ احمد بشیر کا خیال تھا کہ لوگ فلم مکمل طور پر ہمہ تن چشم و ہمہ تن گوش ہو کر دیکھتے ہیں اور جو منظر سمجھ نہ آئے یا جو جملہ سمجھ نہ آئے اس پر غور کر کے اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور فلم کے رائٹر اور ڈائریکٹر کے مطمع نظر کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔حالانکہ اس وقت،اور اب بھی،پاکستان کا فلم بین فلم کو نشست سے ٹیک لگا کر صرف تفنن طبع کے لیے دیکھتا ہے اور وہ کسی سین یا سچویشن پر زیادہ عرق ریزی نہیں کرتا۔لوگ فارمولہ فلمیں دیکھنے کے عادی تھے۔

۲۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری روز اول ہی سے چربہ فلم سازی کے باعث ایسے ماہرین فن سے محروم رہی تھی جو کہ تماشائیوں کے اندر اعلیٰ مذاق پیدا کرتے۔

۳۔ فلم سٹوڈیوز میں دستیاب ہنرمندوں (کیمرہ مین،ایڈیٹر،لیبارٹری پروسیسر، معاون ہدایتکار) نچلے درجے کے ملازمین اور سٹوڈیو سے باہر فلم ڈسٹری بیوٹرز اور ایگزیبیوٹرز نے مختلف ہتھکنڈوں سے نئے پروڈیوسرز اور کہانی کاروں اور ہدایتکاروں کی ریشہ دوانیوں اور پروپیگنڈے نے ایسی کاوشوں کو بدنام کیا۔اشفاق احمد،فیض احمد فیض،حمید اختر وغیرہ کی طرح احمد بشیر کی کاوشیں اس شعبے

میں بری طرح ناکام ہوئیں۔ نیلا پربت کی ہوا بھی انہی حرکتوں کی وجہ سے خراب ہوئی۔

۴۔ پاکستان کے واحد تربیت یافتہ پروڈیوسر ہونے کے باوجود احمد بشیر نے زمینی حقائق کے مطابق اپنی مہارت کو بروئے کار نہ لا سکے۔ انھوں نے اداکاروں اور تکنیک کاروں سے کام لینے کے لیے رائج اور کامیاب طریقہ استعمال نہ کیا جس کے باعث فلم تاخیر کا شکار ہوئی۔

۵۔ انہیں یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ فلم کی مارکیٹنگ بھی ایک اہم ترین مرحلہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں سٹوڈیو کے مالک ایکٹر، ایکٹریس، ٹیکنیشنز، ڈسٹری بیوٹر، فلمی اخبار نویس، سینما والے، ان سب کی اس سفر میں اہمیت ہے اور ان کی اپنی اپنی نفسیات ہیں۔ ان سب کو کس طرح ساتھ لے کر چلنا ہے، یہ اہم پہلو وہ اپنی تکنیکی مہارت کے پندار میں فراموش کر گئے۔ (۱۶) اسی ''فراموشی'' نے انہیں فلم انڈسٹری میں وہ تگنی کا ناچ نچایا کہ پھر انھوں نے فلم انڈسٹری کا کبھی رخ نہ کیا۔

۶۔ ان کا کہانی پیش کرنے کا انداز لوگوں کو نہ بھا سکا۔ ممتاز مفتی کی لکھی ہوئی کہانی ادب عالیہ کا ایک اعلیٰ شاہکار تھی مگر اسے تحریر کرتے ہوئے انھوں نے عوام کے مذاق کا خیال نہیں رکھا تھا۔ علاوہ ازیں ممتاز مفتی کو فلم کے اسکرین پلے لکھنے کا بھی تجربہ نہیں تھا اور نہ ہی انھوں نے کسی سے استفادہ کیا تھا۔ اسی باعث احمد بشیر کو نئے سرے سے اسکرپٹ، خود لکھنا پڑا۔ جبکہ عکسی مفتی کے بقول ،مفتی جی احمد بشیر کے لئے کہانی نہیں لکھنا چاہتے تھے کیونکہ ان کے درمیان دوستی کا لازوال رشتہ تھا۔ مگر احمد بشیر کا بے حد اصرار بلکہ ضد تھی کہ کہانی مفتی جی لکھیں۔ چنانچہ مفتی جی کو احمد بشیر کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ مفتی جی نے جو اسکرپٹ لکھا تھا احمد بشیر نے وہ سارا تبدیل کر دیا۔ مفتی جی شاید کسی اور کو اپنا سکرپٹ تبدیل کرنے کی اجازت نہ دیتے مگر احمد بشیر کے سامنے وہ چپ رہے۔ (۱۷)

۷۔ عام طور پر فلم کی چار ریلیں بنا کر ڈسٹری بیوٹر کو فلم دکھائی جاتی ہے تو وہ عوام کی پسند کے بارے میں مشورہ دیتا ہے کہ فلاں کردار یا فلاں طرح کا گانا وغیرہ کا اضافہ کر لیں۔ چنانچہ پروڈیوسر کے پاس اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ وہ کہانی کے سکرین پلے میں کوئی تبدیلی کر سکے۔ مگر انھوں نے فلم کی آٹھ ریلیں بنا کر جب فلم ڈسٹری بیوٹر کو فلم دکھائی تو اس میں ڈسٹری بیوٹرز کے پاس مشورے کی گنجائش نہ تھی اور نہ ہی ڈسٹری بیوٹر کی فرمائش پوری کرنے کے امکانات نہیں تھے۔ جس کی وجہ سے کوئی ڈسٹری بیوٹر ان کی فلم خریدنے کو تیار نہ تھا۔ یوں سرمایے کی فراہمی رک گئی اور فلم تاخیر کا شکار ہونے کے باعث فلم کی ہوا مزید خراب ہوئی۔

۸۔ فلم کی ناکامی پر احمد بشیر کا اکھڑپن اور حد سے بڑھا ہوا اعتماد بھی اثر انداز ہوا۔ وہ

اپنی دھن کے پکے اور آئیڈیلسٹ انسان تھے۔انھوں نے فلم کی کہانی کو جس طرح اپنے ذہن کے کینوس پر دیکھا تھا۔وہ سلولائیڈ پر بھی اسے اسی طرح منتقل کر کے شائقین کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔جس کے لیے انھوں نے فلم کی لوکیشنز اور سچوایشنز کی فلمبندی پر فلم کے بجٹ سے زیادہ رقم درکار تھی۔اسی وجہ سے فلم کی شوٹنگ بار بار تعطل کا شکار ہوتی رہی۔ان کے منہ بولے بیٹے مجید احمد جو کہ ان کی فلم کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔(احمد بشیر کے ساتھ ان کی رفاقت کا دورانیہ چالیس سال پر محیط ہے۔قربت کا یہ عالم تھا کہ سال میں ایک دو بار ایک دو ماہ کے لیے کراچی جاتے تو قیام اپنی گوپی (بشریٰ انصاری) کے ہاں ہوتا مگر اکثر شامیں مجید احمد کے ہمراہ کراچی کی تقریبات یا سمندر کنارے گزرا کرتیں) ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:ان کے اندر اپنے اوپر تنقید برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔خودسری اور خوداعتمادی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔جن دنوں وہ نیلا پربت بنا رہے تھے انہی دنوں حمید اختر کی فلم ''سکھ کا سپنا'' ریلیز ہوئی مگر بری طرح ناکام ہوئی۔حمید اختر نے فلم کی ناکامی پر ایک بھرپور تجزیاتی مضمون لکھا جس میں برسبیل تذکرہ کہیں ''نیلا پربت'' کا بھی نام بھی آگیا۔جب یہ مضمون چھپا تو بہت برہم ہوئے۔مجید احمد کہتے ہیں کہ میں نے کہا۔کہ حمید اختر نے تو کوئی ایسی بات اپنے مضمون میں نہیں لکھی۔انھوں نے کہا کہ ہاں جان،اس نے اپنی ناکام فلم کے ساتھ میری زیر تکمیل فلم کا ذکر کیا تو کیوں کیا؟ وہ کیا سمجھتا ہے کہ میں ایک ناکام فلم بنا رہا ہوں۔فوراً اس کے بارے میں اپنے جذبات سے بھرپور جواب چھپوا دیا۔حمید اختر یہ خط پڑھ کر حیران ہوا کہ اس نے کون سی ایسی بات اپنے مضمون میں لکھ دی جو احمد بشیر اتنا برہم ہے۔بہر حال دوستی تھی۔انھوں نے جوابی مضمون میں لکھا۔جب احمد بشیر کا یہ مضمون چھپا تو میں لاہور میں ہوں اور وہ کراچی میں۔اگر وہ لاہور ہوتا تو میں اسے بہت مارتا۔(۱۸)

۹۔ وہ نفسیاتی سطح پر بھی اپنے اوپر اعتماد کھونے لگے۔انہیں احساس ہونے لگا کہ انھوں نے فلم بنا کر اپنے فرائض میں آنے والے اہل خانہ کے حقوق بھی سلب کر لیے ہیں،کیونکہ گھر میں فاقوں کی نوبت آ چکی تھی۔ادھر انیس سو پینسٹھ کی جنگ نے بھی ملک کے معاشی حالات کو دگرگوں کر دیا تھا۔چنانچہ ان کے والدین نے اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے ان کے بیوی بچوں کی کفالت بھی کی اور پروین کی لگی ہوئی فلم کی رقم کا بھی کچھ حصہ واپس کیا۔کیونکہ بقول احمد بشیر داماد کاروبار میں صرف منافع کے حصہ دار ہوتے ہیں۔لیکن اس دوران ان کے اہل خانہ کا صبر اور توکل دیدنی تھا اور یہی احمد بشیر کی اصل توانائی تھی:

''پیپلز پارٹی کے قیام کے بعد جب محمد حنیف رامے نے لاہور سے روز نامہ مساوات کا آغاز کیا تو انہیں اس اخبار میں انچارج ایڈیٹر کے طور پر ملازمت مل

گئی اور ان کا قلم اپنی جولانیاں دکھانے لگا۔ یہاں صفدر میر سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ حنیف رامے بھی ان کے مزاج سے آگاہ تھے اور ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ اپنی حق گوئی اور بیباکی کے باعث پیپلز پارٹی کے بااختیاروں کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ اسی دوران میں دوستوں کی مہربانیوں خصوصاً قدرت اللہ شہاب اور قمر تسکین کے تعاون سے انہیں فلم بنانے کا کام ملا اور چولستان تھر پارکر دالبندین، چاغی اور دیگر صحرائی علاقوں کی ڈاکومنٹری فلم بنائی ۱۹۷۴ء میں قدرت اللہ شہاب کی سربراہی میں حکومت نے سٹیٹ فلم ڈویلپمنٹ اتھارٹی تشکیل دی تو ان کے فلم کے شعبے میں خدمات اور تجربے کے علاوہ ان کی فلم میکنگ کی تربیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے احمد بشیر کے نام قرعہ فال نکلا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس عہدے کے لیے صفدر میر کو پیشکش ہوئی تھی۔ انھوں نے کراچی میں ولیج ایڈ کے تحت متعدد دستاویزی فلمیں بھی بنائی تھیں'' ۔(۱۹)

سٹیٹ فلم اتھارٹی

سٹیٹ فلم اتھارٹی کا چیئرمین عبدالحفیظ پیرزادہ تھا۔ جو کہ وزیر قانون اور تعلیم تھا۔ جبکہ احمد بشیر کو اس کا ڈائریکٹر جنرل بنا کر اسلام آباد بھیج دیا گیا۔ مگر واضح رہے کہ وہ اس عہدے کے لیے کسی سفارش کے بل بوتے پر نہیں تعینات ہوئے تھے بلکہ اس پوزیشن کے لیے باقاعدہ ان کے ٹیسٹ اور انٹرویوز ہوئے۔ ہر چند کہ ان کے انتخاب میں قدرت اللہ شہاب کا ووٹ ان کے پلڑے میں تھا۔ مگر اس کی وجہ ممتاز مفتی کی قربت یا ذاتی تعلقات نہیں بلکہ احمد بشیر کی لیاقت تھی۔

قائداعظم (دستاویزی فلم)

یہاں انھوں نے قائداعظم کے صد سالہ جشن ولادت کے حوالے سے ایک دستاویزی فلم ''قائداعظم'' بنائی۔ یہ ایک دستاویزی فلم تھی۔ اس فلم میں قائداعظم کی متحدہ ہندوستان کے دور میں مختلف اوقات میں مختلف برطانوی اور ہندوستانی رہنماؤں کے ساتھ بنائی گئی فلموں کو، جو پاکستان کے محکمہ اطلاعات و فلم مطبوعات کے پاس نہیں تھیں، ہندوستانی سفارتخانے کے توسط سے ہندوستان سے منگوا کر شامل کی گئیں۔ یہ اسٹیٹ فلم اتھارٹی کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ قائداعظم کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر یہ فلم پاکستان ٹیلی ویژن پر دکھائی گئی۔ یہ فلم احمد بشیر کے فن فلم سازی کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ یہ فلم بائیس ریلوں پر مشتمل تھی (۲۰)۔

چڑی کہانی (بیلے فلم)

اس کے بعد انھوں نے ایک میوزیکل فلم شروع کی (جس میں مکالے نہیں تھے) جس کا نام چڑی کہانی تھا۔اس فلم کے لئے جو فنڈز درکار تھے وہ انھیں سرکار پاکستان سے جاری کروانے میں قدرت اللہ شہاب کا بہت حصہ تھا۔اس فلم کی تیاری کے حوالے سے عکسی مفتی کہتے ہیں (۲۱)۔

> ''دراصل احمد بشیر نے فلم میکنگ کی جو تربیت حاصل کی تھی۔ان کے ذہن میں فلم میکنگ کے لیے نئے نئے آئیڈیے آتے رہتے۔چڑی کہانی کے لئے انھوں نے قدرت اللہ شہاب کو کہا تھا۔شہاب صاحب نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے انھیں چڑی کہانی کے لئے فنڈز مہیا کئے اور یہ فلم بنی۔چڑی کہانی بھی کہنے کو تو بچوں کی فلم تھی مگر اس میں احمد بشیر نے بڑے لیول کی باتیں کی تھیں (۲۱)۔''

اس فلم کو ایران سے ایوارڈ بھی ملا۔ہر چند کہ یہ فلم بچوں کے لیے تھی مگر اس میں حریت اور آزادی کی جدو جہد کا درس دیا گیا تھا۔فلم کی کہانی کچھ اس طرح تھی کہ چڑیاں مل کر کھیت سے چاول لاتی ہیں اور کھچڑی پکا کر پانی لینے کے لیے جاتی ہیں تو کوا آ کر ان کی کھچڑی ہڑپ کر جاتا ہے۔اور چین سے سو جاتا ہے۔اس کہانی میں یہ اضافہ کیا گیا تھا کہ چڑیاں اس غصب کا بدلہ لینے اور آئندہ سے جارح کا حملہ روکنے کے لیے آپس میں مشورہ کر کے عملی جدو جہد کرنا شروع کر دیتی ہیں اور اپنی فریاد لے کر چاند میں چرخہ کاتنے والی بڑھیا کے پاس جاتی ہیں۔بڑھیا انکی کہانی سن کر ایک تنکہ انہیں دے دیتی ہے وہ یہ تنکہ لے جا کر سوئے ہوئے کوے کی آنکھوں میں مار کر اسے اندھا کر دیتی ہیں اور آخر کار وہ اپنا انتقام لینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں اس کہانی کا مقصد یہ تھا کہ جو جابر جاگیر دار لوٹ کے لے جاتا ہے کسان اس کا مقابلہ مسلح جدو جہد سے کر سکتے ہیں۔بھٹو اور دیگر زعماء نے یہ فلم دیکھی تو زیرک اور تیز دماغ بھٹو فوراً سمجھ گئے کہ احمد بشیر اپنی فلم کے ذریعہ کیا پیغام دینا چاہتے تھے۔اس کے بعد اقبال کے صد سالہ یوم پیدائش پر فلم کا اسکرپٹ لکھا جا چکا تھا۔مگر پھر مارشل لاء آ گیا اور سب کچھ اتھل پتھل ہو گیا۔ سٹیٹ فلم اتھارٹی ختم ہو گئی۔احمد بشیر ملازمت سے فارغ ہو گئے۔انہوں نے سندھ صوبہ کے پس منظر میں ایک اور سکرپٹ BATTLE OF MIANI کے نام سے لکھا تھا۔ پھر مارشل لاء کے سبب سب کچھ ختم ہو گیا۔(۲۲)

صحافت کی طرف مراجعت

سٹیٹ فلم اتھارٹی کے بند ہونے کے بعد احمد بشیر پھر صحافت کی طرف لوٹ آئے۔ پہلے روز نامہ مسلم سے منسلک ہوئے۔ پھر جب روز نامہ جنگ لاہور سے شروع ہوا تو انھوں نے اس میں مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ پھر جب ایڈیٹران کے تلخ ترش قلم کی تاب نہ لا پایا تو وہ یہاں سے بھی نکال دیئے گئے۔ احمد بشیر کہتے ہیں کہ بعد میں میر خلیل الرحمان نے بتایا کہ انہیں اس وقت کے سیکرٹری اطلاعات میجر جنرل مجیب الرحمان کی دھمکی کے نتیجے میں نکالا گیا تھا کیونکہ انھوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس شخص کی تحریر کا یہی انداز رہا تو مارشل لاء کی کسی دفعہ کے تحت اخبار کو بند کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد انھوں نے انگریزی روز نامہ ڈان میں اپنے نام سے اور سٹار میں بلھے شاہ اور کبھی احمد شاہ کھرل اور شاہ عنایت کے فرضی ناموں سے کالم لکھنا شروع کر دیئے۔ ضیاء الحق کے رخصت ہونے کے بعد نئی حکومت نے سابقہ حکومت کی طرف سے مختلف شعبوں سے متعلق افراد کو دیئے گئے پلاٹوں کی فہرست شائع کی تو اس میں احمد بشیر کا بھی نام تھا۔ شہر میں یہ خبر عام ہوئی تو ایک صاحب نے ان سے پوچھ لیا۔ احمد بشیر نے کہا" میں نے تو وہ پلاٹ اسی وقت بیچ دیا تھا" اور پھر مسکرا کر کہا۔" جب یہ پلاٹ ملا تھا اس سے اگلے دن کا میرا کالم پڑھو۔ میں نے اپنے قلم کا رخ نہیں موڑا"۔ ان کا یہ کہا ہوا سو فیصد درست تھا کیونکہ مارشل لاء کے دور میں ان کو کئی مرتبہ تنبیہ کی گئی۔ مگر انھوں نے ساری زندگی پڑھنے، سچ لکھنے اور سچے لوگوں سے پیار کرنے میں گزار دی۔ پھر جب انگریزی روز نامہ" فرنٹیئر پوسٹ" نکلا تو اس کے صفحات پر بھی احمد بشیر کا قلم جولانیاں دکھانے لگا۔ یہ پرچہ بہت چلا۔ اس اخبار نے حکومت کے دباؤ کا مقابلہ کیا اور احمد بشیر کو مسلسل چھاپتا رہا۔ اور جب یہ روز نامہ لاہور سے بند ہو گیا تو انہیں پشاور سے شائع ہونے والے فرنٹیئر پوسٹ میں پوسٹ کر دیا گیا۔ مگر جب یہ پرچہ بند ہو گیا تو وہ پھر ایک بار بے روزگار ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک ماہنامہ" نیاز مانہ" میں لکھنا شروع کر دیا۔ انھوں نے زندگی کا آخری کالم ۲۰۰۳ء میں لکھا جس کے بعد ان کی بیماری نے انہیں لکھنے کی اجازت نہ دی۔

دیگر مشاغل

ادب و صحافت کے علاوہ انہیں موسیقی سے بھی تعلق تھا۔ وہ کن رس تھے اور سر آشنا تھے۔ خود نہ گاتے تھے نہ کوئی ساز بجاتے تھے مگر راگ اور راگنیوں کی پہچان رکھتے تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت، جو رقص و نغمہ کے بہت رسیا تھے ایک دفعہ مختار بیگم کے بالا خانے پر گانا سننے گئے تو انہیں بھی ساتھ لے گئے۔ مختار

بیگم نے راگ میں الاپ لیا۔مولانا نے کہا اس میں کومل سر لگتا ہے۔مختار بیگم نے تیور لگایا تھا۔مولانا بھی کم کن رس نہیں تھے مگر ان کا موسیقی کے بارے میں علم واجبی سا تھا۔اس نے کہا تیور لگتا ہے مولانا نشے میں تھے اپنی بات پر اڑ گئے۔آخر احمد بشیر نے دخل در معقولات دیتے ہوئے کہا۔''مولانا! اس میں کومل اور تیور دونوں لگائے جاسکتے ہیں۔مولانا نے چونک کر اپنے نائب کی طرف دیکھا اور مان گئے۔بس اس روز کے بعد مولانا جب بھی گانا سننے کے لیے جاتے تو احمد بشیر ان کے ساتھ ہوتے۔''

موسیقی کے علاوہ انہیں زائچہ نویسی اور علم جفر سے بھی شغف تھا۔جن دنوں وہ فلم بنا رہے تھے ان دنوں وہ علم نجوم اور جفر کی طرف مائل ہوئے تھے۔ملتان میں ایک ماہر علم جفر اختر شاد گیلانی سے ان کی ایک عرصے تک خط و کتابت جاری رہی۔(انھوں نے اپنے خطوط میں اختر شاد گیلانی کا ذکر کیا ہے) مگر موصوف سے وہ خاطر خواہ رہنمائی حاصل نہ کر سکے۔کیونکہ بقول ان کے جس کسی کو یہ علم حاصل ہو جائے وہ بآسانی اسے کسی دوسرے کو منتقل نہیں کرتا۔البتہ وہ معروف ستارہ شناس اختر امرتسری کے معترف تھے اور ان کی استعداد علمی سے مستفید بھی ہوئے۔مگر انھوں نے عملی طور پر اس علم سے استفادہ نہیں کیا۔حالانکہ چند مرتبہ انھوں نے ریس کھیلنے والے اپنے دوست کو جیتنے والے گھوڑے کے بارے میں بھی بتا کر حیران کیا۔مگر انھوں نے خود کبھی اس امید پر ریس نہیں کھیلی۔پھر کوشش کی بھی مگر اس میں کوئی قابل ذکر مہارت نہ حاصل کر سکے۔ان کے کاغذات میں ایک پرانی جنتری اور ایک نوٹ بک بھی موجود ہے اس نوٹ بک میں علم جفر کے حوالے سے تعویذات اور زائچے کی تیاری کے لیے وقت پیدائش دیگر مقامات کے اوقات کے حوالے سے مقامی وقت پیدائش کا تعین کرنے کے فارمولے بھی تحریر ہیں۔یہ نوٹ بک جس قسم کے نوٹس پر مشتمل ہے اسے دیکھتے ہوئے ان کی تحریر پر کسی مبتدی کی مشق کا گمان ہوتا ہے۔جن دنوں وہ روزنامہ مساوات میں تھے ان دنوں ان کے پاس ایک صاحب شبلی بی کام جو پاکستان ٹائمز کے کامرس سیکشن کے انچارج تھے، آیا کرتے تھے۔یہ دونوں مل کر علم جفر کے حوالے سے حساب کتاب کرتے تھے کہ انقلاب کب آئے گا۔کبھی کبھار موج میں ہوتے تو ہاتھ بھی دیکھ لیتے۔جن لوگوں کے ہاتھ انھوں نے دیکھے ان میں سے بعضوں سے راقم کا مکالمہ ہوا ہے۔سب مذکورہ علوم میں ان کی غیر معمولی شدھ بدھ کے قائل ہیں۔(۲۳)

وہ نوے کی دہائی میں عالمی پنجابی کانفرنس میں شرکت کے لیے انڈیا گئے تو وہاں انھوں نے دلی کی لائبریریوں میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر علم جفر کے مخطوطے تلاش کیے اور ان کی فوٹو سٹیٹ کروائیں۔یہ تمام مخطوطے، ایک نوٹ بک مع چالیس پچاس کتب، نیلم بشیر نے پنجابی ادبی انسٹی ٹیوٹ

کی لائبریری کو عطیہ کر دیئے ہیں یہ تمام کتب انگریزی میں ہیں۔ان میں آرکیالوجی، برصغیراور بین الاقوامی تاریخ اور اقوام عالم کی جدوجہد کی تاریخ پر مبنی کتب شامل ہیں۔ مجلد مخطوطے (صفحات، سائز ۱۲x۱۸: ۷۸۰) پر ان کے ہاتھ کا لکھا یہ نوٹ ان الفاظ میں ہے۔۔'' جفر جامع عرف کتاب التقدیر یا لوح محفوظ جس میں ساوی قوتوں سے مکالمے کے اسرار درج ہیں۔کلید استخراج اس مجموعے میں شامل نہیں۔زندگی نے مہلت دی اور اللہ نے رہنمائی فرمائی تو وہ بھی شامل کر دوں گا۔'' مذکورہ بالا نوٹ بک میں بھی ستاروں کی گردش کے حساب کی نوعیت، کسی مبتدی کی مشق کا پتہ دیتی ہے۔(۲۴) ان کے بعض خطوط سے علم جفر پر ان کے ایقان اور آگاہی کا سراغ ملتا ہے۔ایک خط بنام عباس دیکھیے:

> '' پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اپنی تلاش میں بفضل ربی کامیاب ہوا اور اب کچھ اسرار مجھ پر کھل گئے ہیں۔میں علم کامل سے ہم کلام ہوں۔پوچھا 'امریکا عراق تنازعہ کیسے طے ہوگا؟' جواب ملا 'عرب خلیج جنگ سے طے گا۔' پوچھا۔'احمد بشیر کے مرض کی دوا کیا ہے؟ جواب۔'دوا مرض دور نہ کرے گی۔' پوچھا ۔جتوئی کے بعد دوسرا وزیراعظم کون ہوگا' جواب۔بےنظیر بھٹو ہوگی۔پوچھا، اسے مرکز میں کتنی سیٹیں ملیں گی جواب۔ایک سوایک۔مگر ایک سوتین، ایک سو چار اور ایک سو سات بھی بنتا ہے۔وغیرہ وغیرہ، مگر ابھی میری تلاش جاری ہے ۔ابھی میں درجہ کمال تک نہیں پہنچا۔اگر مجھے فارسی اچھی طرح آتی تو کچھ مشکل نہ تھا کیونکہ اس مضمون کی قلمی کتابیں میں نے خدا جانے کہاں کہاں سے جمع کر لی ہیں اور میرے بعد ان کا کیا حشر ہوگا؟'' آگے چل کے اسی خط میں لکھتے ہیں :'' اپنے لیے میں نے صرف علم کی روشنی مانگی تھی، سو مجھے بھی وہ مل گئی گرچہ کامل نہیں، مگر اتنا بھی کس کے پاس ہے۔''(۲۵)

اپنے متعدد خطوں میں وہ مکتوب الیہ کو بعض امراض کے علاج کے لئے ہومیو پیتھک اور بائیوکیمک کی ادویہ بھی تجویز کرتے تھے اور تجویز کردہ ادویہ کے بارے میں اپنا تجربہ بھی بیان کرتے تھے اس کے علاوہ وہ اپنے ملنے جلنے والوں، اعزہ و اقربا کو بھی مذکورہ طریقہ علاج کا مشورہ دیا کرتے تھے جس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ وہ ہومیو پیتھک اور بائیوکیمک کی ادویہ کے بارے میں بھی علم رکھتے تھے۔

احمد بشیر کی تصانیف (مطبوعہ)

۱۔ جو ملے تھے راستے میں	(خاکے)	مرتبہ: یونس جاوید
۲۔ خونِ جگر ہونے تک	(کالموں کا مجموعہ)	
۳۔ ڈانسنگ ودوی ڈلف	(انگریزی کالموں کا مجموعہ)	
۴۔ دل بھٹکے گا	(ناول)	
۵۔ خطوں میں خوشبو	(مکاتیب)	مرتبہ: نیلم احمد بشیر
۶۔ خون کی لکیر	(مشمولہ کتاب دو تحریریں، از نیلم احمد بشیر)	

غیر مطبوعہ تحریریں

احمد بشیر کے امروز کے پہلے دور کے کالم اور فیچر (جو دیال سنگھ لائبریری میں محفوظ روز نامہ امروز کے اولین دور کے اخبارات کے صفحات میں شامل ہیں۔ ان کی تالیف اور تدوین کے لیے پھر ایک یونس جاوید کی ضرورت ہے۔) احمد بشیر کی تصانیف کا ادبی و صحافتی حوالے سے تعارف اور تنقیدی جائزہ آئندہ ابواب میں لیا جائے گا۔ علاوہ ازیں احمد بشیر کے روز نامہ امروز میں لکھے گئے اور دیگر کالموں کا ایک مجموعہ شہر سرائے کے نام سے زیر ترتیب ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کے چھوڑے ہوئے انگلش اردو مضامین ان کی بیٹی اور ادبی وارث نیلم احمد بشیر کے پاس محفوظ ہیں جن کی اشاعت کے لیے پیش رفت جاری ہے۔

دم واپسیں

احمد بشیر کئی برسوں سے سرطان کے عارضے میں مبتلا تھے ان کے معالجین کا کہنا تھا کہ مرض اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ ایک ڈیڑھ برس سے زیادہ نہیں جی سکتے۔ ایک طرح سے ڈاکٹروں نے انہیں لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ بوجوہ انہیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ انہیں سرطان ہے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ انہیں السر ہے۔ مگر شاید انہیں پتہ تھا کہ وہ اس موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ ضعیف العمر ہونے کے باوجود برسوں وہ اپنی قوت ارادی سے اس موذی مرض سے آخری سانس تک لڑتے رہے۔ ایک شام ان کی جسمانی تکلیف کو دیکھتے ہوئے گھر والوں نے انہیں سروسز ہسپتال داخل کروادیا۔ احمد بشیر کی زندگی کے اواخر کا منظر نامہ محترمہ نیلم احمد بشیر نے یوں لکھا ہے۔

> "ابا کی زندگی کا ڈرامہ اب اپنے آخری ایکٹ میں داخل ہو چکا تھا۔ ان کی یرقان زدہ پیلی اور سرمئی آنکھیں دھندلی سی نظر آتی تھیں۔ یہ وہ آنکھیں تھیں جن

سے وہ ہماری طرف بطور باپ رعب سے دیکھتے تو ہم منجمد ہو کر رہ جایا کرتے
خون میں زہر پھیل جانے کی وجہ سے کھجلی انہیں بے حال کیے ہوتی تھی۔ منہ میں
زخم تھے اس لیے کھانے پینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ روح جسم کے تکلیف
دہ جہنم سے پھڑ پھڑا کر نکلنے کے لیے زور آزمائی کر رہی تھی اور ابا کے گرد چاہتوں
اور محبتوں کا میلہ شاید اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔" (۲۶)

کرنل عباس کہتے ہیں:

''جب انہیں ہسپتال لے جایا جا رہا تھا تو وہ گھر کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کہ انہیں
یقین ہو چلا تھا کہ وہ دوبارہ اس گھر میں کھلی آنکھوں اور قائم حواس سے واپس
نہیں آئیں گے ان کے لبوں پہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔ انھوں نے جب نوکروں
اور بچوں کو ہاتھ ہلا کر الوداع کہا تو سب گھر والوں کی آنکھیں بھر آئیں''۔ (۲۷)

سروسز ہسپتال کے بالائی وارڈ کے کمرہ نمبر تین میں عارضی نقل مکانی کے بعد سارے گھر والوں نے یہیں ڈیرے لگا لیے جبکہ ان کا دوست نما داماد، کرنل عباس ہمہ وقت اپنے اس محبوب سسر کے ساتھ رہا۔ احمد بشیر کا بیٹا جو امریکہ میں فروکش ہے۔ وہاں سے سارا دن اس کے فون آتے رہتے۔ جب ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو پروین نے ہمایوں کو فوراً پہنچنے کو کہا۔ اس نے فلائٹ لی اور دوسرے دن آ گیا۔ ایک ہفتہ رہا۔ ہمایوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جانے سے پہلے جب وہ ملنے گیا تو اس نے اپنے واپس جانے کا نہیں بتایا مگر انھیں پتا چل گیا۔ جب وہ روتا ہوا رخصت ہوا تو خود بھی تادیر روتے رہے۔ (۲۸) بقیہ ایام میں اس کی کمی کو کرنل عباس نے پورا کیا۔ کرنل عباس انہیں بڑے ابا کہہ کر بلایا کرتے اور ان سے ہر دکھ سکھ بانٹتے تھے۔ ہسپتال میں ان کی بیٹی سنبل نے فجر کی نماز پڑھ کر جب انہیں دم کرتے ہوئے کہا کہ آج آپ کی نیند کے لیے ایک سپیشل دوائی آ رہی ہے جس کے بعد آپ سکون سے سو جائیں گے یکا یک انھوں نے اپنی مبہم بڑبڑاہٹ کے درمیان واضح طور پر سنبل سے پوچھا۔ ''موت کدوں آئے گی؟''۔۔۔ یہ ان کی زبان سے نکلا ہوا آخری جملہ تھا اس کے بعد ایک نہ ختم ہونے والی چپ۔۔۔!!! بولتا ہوا چمن خاموش ہوگیا۔ زندگی بھر سماجی ناانصافی اور فرسودہ عقائد کے خلاف جہاد بالقلم کرنے والا یہ مجاہد ۲۵ دسمبر ۲۰۰۴ء (۲۹) کی شب کو اپنے قلم کی حرمت اور عظمت کی امانت آنے والے اہل قلم کو سونپ کر دنیا سے رخصت ہوا۔ **اناللہ وانا الیہ راجعون۔**

احمد بشیر کی وہ بیٹیاں جنھیں انھوں نے بیٹوں کی طرح پالا تھا۔ جنھیں وہ پیار سے'' میری

گو پیاں'' کہا کرتے تھے۔جنھیں ہر کٹھن اور پریشان کن لمحے میں اپنے ابا کی ٹیک ہوتی تھی جوان کا دوست بھی تھا باپ بھی ہمدرد بھی مشیر بھی اور رفیق بھی۔ جب ان کے ابا کا جنازہ اٹھا تو ان کی مطلاطم آنکھوں نے اسی طرح ابا کو رخصت کیا جیسے بیٹیاں کیا کرتی ہیں۔ جب کلمہ کا ورد کرتے ہوئے احمد بشیر کی چارپائی اٹھائی گئی تو ان کی لاڈلی بہن پروین عاطف نے روتے ہوئے کہا دیکھو جس شخص نے کبھی کسی کندھے کا سہارا نہیں لیا تھا وہ آج کندھوں پر سوار جا رہا ہے۔(۳۰) عوام وخواص کی کثیر تعداد نے ان کے جنازے میں شرکت کی جن میں شیخ منظور الٰہی ،حمید جہلمی ،آئی اے رحمان ،عزیز مظہر ،حسین نقی ، جاوید اقبال ، یونس جاوید ،ڈاکٹر نذیر قیصر ،ڈاکٹر شہزاد قیصر ،حمید اختر ،ظفر صمدانی ،طارق عزیز ،منو بھائی ، اصغر ندیم ،قوی خاں ،انتظار حسین ،زاہدہ کاسی ،کرنل عباس ، عابد حسن منٹو ،شعیب عادل اور دیگر کئی مشہور ادیب ،شاعر ،صحافی اور دانشور شامل تھے۔ان سب کی موجودگی میں ایف سی سی روڈ (مین مارکیٹ گلبرگ کے عقب میں)ایک چھوٹے سے قبرستان میں انہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔سیاہ پتھر سے بنے ہوئے ان کے مرقد پر ان کی تاریخ پیدائش ۲۴۔مارچ ۱۹۲۵ء اور تاریخ وفات ۲۵۔دسمبر ۲۰۰۴ء درج ہے۔قبر کے کتبے پہ کندہ ان کا پسندیدہ ،مولانا روم کا یہ شعر بھی ان کی زندگی کی داستان سنا رہا ہے۔

حاصل عمر سہ سخن بیش نیست　　　　خام بدم پختہ شدم سوختم

زندگی بھر کی جدوجہد ،ایثار ،قربانیاں ، ناکامیاں ،جولانیاں ، دلیریاں ،دلبریاں ،رعنائیاں تنہائیاں اور خاموش نگر میں یہ مرقد! میر کا یہ شعر زندگی کی توقیر و تفسیر بیان کرتا محسوس ہوتا ہے ۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم　　　　اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

تعزیتی بیانات ،تاثرات اور جذبات

ٹی وی چینلز ،اور بی بی سی لندن نے احمد بشیر کی وفات کی خبر نشر کی ۔اس کے ساتھ ساتھ ملک کے سبھی اخباروں نے احمد بشیر کی رخصتی کی خبر روایتی انداز میں جلی سرخیوں میں شائع کی جن میں انہیں نڈر ،آدرش وادی ،حق گو صحافی قرار دیا اور ان کی موت کو ناقابل تلافی نقصان قرار دیا گیا۔ان کے خوشہ چینن اور ان سے فیض پانے والے بہت سے لوگ آج بھی شعبۂ صحافت میں موجود ہیں۔اخبارات کے اداریوں اور کالموں میں انھیں خراج تحسین پیش کیا گیا۔ماہنامہ ''نیا زمانہ'' لاہور کے شمارہ فروری ۲۰۰۵ء میں احمد بشیر کی یاد میں ایک گوشہ مخصوص کیا جس میں شعیب عادل (مدیر) امتیاز عالم ،حمید اختر ، سرفراز سید ،زاہدہ کاسی ،سید نصیر زبیرا یوسف ،صبیحہ حسن ،پرویز مجید ،حسین شاہد ،ظفر چوہدری ،انور سدید ،

اظہر جاوید، مستنصر حسین تارڑ، افضل توصیف، طاہر اصغر نے اپنے ساتھ احمد بشیر کے گزرے وقت اور واقعات کے حوالے سے ان کی سیرت پر روشنی ڈالی ہے فلمی مؤرخ اور صحافی زاہد عکاسی نے روزنامہ جنگ میں ان کی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کالم ''خاموش ہو گیا ہے وہ سچ بولتا ہوا'' لکھا ۔(۳۱) روزنامہ جنگ کے ادبی ایڈیشن میں رؤف ظفر نے انہیں تعزیتی مضمون میں خراج تحسین پیش کیا۔ جس کا عنوان تھا۔'' احمد بشیر ۔۔ادب و صحافت میں ہنگامہ خیز زندگی گزارنے والے بے باک ادیب''(۳۲)

عالمی پنجابی کانگرس کے زیر اہتمام جناب فخر زمان اور سیفما کے امتیاز عالم نے تعزیتی ریفرنس کروا کر اس عظیم فنکار کو یاد کیا۔(۳۳)

پی ٹی وی کے پروگرام'' خراج تحسین'' میں انہیں مشاہیر اور ملک کے ادیبوں اور صحافیوں ،جن میں انور سدید، مستنصر حسین تارڑ، اصغر ندیم سید۔ احمد عقیل روبی، فخر زمان، اسلم اظہر، ڈاکٹر عمر عادل، خالد حسن، صبیحہ احمد، حمید اختر، ارشاد حقانی، عبدالقادر حسن، شاہد محمود ندیم، بشریٰ انصاری اور دیگر نے اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ پروگرام کے میزبان انور مقصود تھے۔ ذیل میں درج احمد بشیر کے بارے میں یہ آرا اور تاثرات ، اخبارات میں جاری بیانات اور کالموں ، مضامین اور پروگرام۔ ''خراج تحسین۔'' سے ماخوذ ہیں:(۳۴)

اصغر ندیم سید

''زندگی میں کئی مواقع آئے ہوں گے جب احمد بشیر کے قلم اور ضمیر کی ٹھیک ٹھاک قیمت لگی ہوگی۔ مگر انھوں نے جہاں اپنی قیمت لگوائی تھی وہاں لگوائی آج وہ ایک انصاف پسند اور صحت مند معاشرے کا خواب دیکھنے والوں میں سب سے آگے کھڑا ہے۔''(کڑوا سچ (کالم) بعنوان: اشفاق احمد کے بعد احمد بشیر بھی مشمولہ روزنامہ جنگ ۲۶۔دسمبر ۲۰۰۴)

مستنصر حسین تارڑ

''صحافت ان کا روزگار بن گئی لیکن کاروبار نہ بن سکی چنانچہ انھوں نے پوری زندگی ایک مجذوب کی مانند گزار دی۔''(نیاز مانہ لاہور فروری ۲۰۰۵ء ،ص:۴۹)

سید نصیر شاہ

''احمد بشیر کے متعلق یہی کہا جائے گا وہ سچ کی طرح کڑوا شخص تھا اس کے بہت سے دوست اس کے لفظوں سے بدذائقہ ہوئے۔۔۔وہ کھرا اشتراکی تھا اور اپنے نظریات میں کھرا ہی رہا۔اسے موقع پرستانہ ترمیم پسندی سے ہمیشہ نفرت کی اور یہی نفرت اسے ناقابل برداشت بنا گئی۔'' (نیا زمانہ فروری ۲۰۰۵ص:۴۱)

ڈاکٹر انور سدید

''احمد بشیر سے اختلافات کے بیسوں پہلو ہو سکتے ہیں لیکن اس کی اس خوبی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی امیدوں کو رجائیت پسندی سے زندہ رکھنے والا اور نامساعد حالات میں بھی باطل کو اپنی تلوار سے گھائل کر دینے والا دانشور تھا ۔اس کی نظریاتی پختگی حریف کو اختلاف کرنے کا موقع دیتی لیکن وہ ہر اختلاف دلیل سے رد کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور اس کی باتوں میں بے شمار کتابوں کے مطالعے کی روشنی نظر آتی تھی۔''(نیا زمانہ فروری ۲۰۰۵ ص:۴۵)

عبدالقادر حسن

''۔۔۔احمد بشیر جو کہتا تھا وہ ویسا ہی تھا اور اس کی یہی غیر منافقانہ اور'' کافرانہ'' زندگی مجھے بہت عزیز تھی۔''

ارشاد حقانی

''جناب احمد بشیر کی کسی رائے سے مجھے اختلاف ہو سکتا ہے اور ہم دونوں کو ایک دوسرے کی بہت سی آراء سے اختلاف ہے لیکن میں نے احمد بشیر کو ہمیشہ ایک سچا انسان پایا۔''

شاہد محمود ندیم

''بلھے شاہ کا اوتار احمد بشیر ہی تھے''

ڈاکٹر عمر عادل

''اسے اپنے علم اور دلائل کو انی بنانے کا فن آتا تھا۔ایک ایسی نوکیلی انی جو مخالف کے تنے ہوئے انا، کے غبارے کو چھوتے ہی ربڑ کے چھیچھڑے میں بدل ڈالے وہ بڑا نڈر بے دھڑک، بے خوف جو کبھی لڑنے والا جنگجو تھا۔''

بشریٰ انصاری

''ابا ایک ایسا لفظ ہے،ایک پیار کا سمندر یوں تو ان کے اندر ہمارے لیے ماما تھی۔میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں نے اپنے ابا جیسا ایماندار کوئی نہیں دیکھا ان کی ذات ہماری سب کی زندگیوں پر گہرا اثر چھوڑ گئی۔''

احمد عقیل روبی

''جب بھی منہ سے کچھ کہا ہنگامہ برپا ہو گیا۔''

اسلم اظہر

''کھانے پینے کے انداز میں بھی بڑے دیسی تھے،صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے لیکن ذہن ان کا جدید ترین تھا ہر بات کی گہرائی میں جاتے تھے بصیرت تھی۔احمد بشیر میں بہت دم تھا۔''

"He was the most beautiful being. He was very smart and intelegient man."

فخر زمان

احمد بشیر بہت ہی مختلف شخص تھا۔وہ بہت ہی الگ شخص تھا اور بہت ہی Humble تھا۔۔ہو سکتا ہے اگلی پیڑھی میں اگلی نسل میں پھر کوئی احمد بشیر آئے ہمیں اگلی نسل سے مایوس نہیں ہونا چاہیے مگر وہ احمد بشیر جنہیں میں جانتا تھا پھر کبھی نہ آ سکے گا۔''

انور مقصود

پہلے انسان پھر صحافی پھر ادیب پھر شوہر پھر باپ پھر بھائی پھر دوست جس راستے کو اپنایا اسی پر چلتے رہے ۔۔۔۔ جو کچھ کہنا چاہتے تھے کہہ گئے ۔ جو کچھ لکھنا چاہتے تھے لکھ گئے یہی بڑے آدمی کی نشانی ہے ۔ بانکے جو ہوتے تھے ان کا تعلق کسی نہ کسی دربار سے ہوتا تھا احمد بشیر ایسے بانکے تھے جس نے دربار کی طرف دیکھا بھی نہیں ۔ اپنے بانکپن اور اپنی وضع کو برقرار رکھا۔

سرفراز سید

عشق کی ہو بہو تصویر کھینچنے والا ایک اور سچ بولنے والا شخص چلا گیا (کچھ باتیں کچھ یادیں از سرفراز سید مضمون مشمولہ ، نیاز مانہ ، لاہور ، فروری ۲۰۰۵)

خالد احمد (صحافی)

خدا جانے احمد بشیر نے لکھنے کا فن کہاں سے سیکھا اور اتنا علم کیسے حاصل کر لیا۔

شعیب عادل (ایڈیٹر نیا زمانہ)

احمد بشیر کے بعد شاید ہم میں سے کسی میں بھی اتنا حوصلہ نہیں کہ وہ سچ کے لیے زندگی کی آسائشیں قربان کرے ۔

امیرہ جویریا

احمد بشیر آزادوں کا آزاد ہے ۔ کسی سے ڈرتا ہی نہیں ۔

خالد حسن نے اپنے مضمون (Ahmad Bashir the last Warrior) میں احمد بشیر کو پاکستان کا جارج آرویل قرار دیا ۔ جارج آرویل وہ معروف ادیب ہیں جنہوں نے برطانوی فوج میں ملازمت کی اور برصغیر میں مختلف جگہ تعینات رہے ۔ انھوں نے برطانوی سامراج کی اصلیت اپنی تحریروں میں بیان کی ہے ۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حواشی وحوالہ جات

ا۔بشیر نے ناول۔۔دل بھٹکے گا۔۔۔میں ایمن آباد کا نام نور پور لکھا ہے۔اس سوانحی ناول کے مندرجہ ذیل اقتباس سے اس علاقے کے لوگوں کی بود و باش اور ماحول اور معاشرت کا سراغ ملتا ہے۔اقتباس ملاحظہ کریں۔

''نور پور (ایمن آباد) ایک چھوٹا سا خوش حال قصبہ تھا۔اس کے مکان پکے تھے اور مکین اور مالک ہندو ساہوکار اور مہاجن۔مسلمان صرف اہل حرفہ تھے،مگر نہایت باکمال لوہار توپوں کی مرمت میں مشاق ،سنار زیورات گھڑنے میں استاد ،سنیارے کون آلود جواہرات دھونے میں بے مثل ،جولاہے ریشم کاتنے اور کپڑا بننے میں حرف آخر،موچی لاجواب کاٹھیاں بناتے تھے،معاہدے لکھنے کے لیے عمدہ سے عمدہ کاتب،تعمیرات کے لیے قابل فن انجینئر اور باغات کے لیے اعلیٰ درجے کے باغبان،یہ چھوٹا سا قصبہ ہنرمندوں کا جزیرہ تھا۔نور پور لاہور پر حملے کے لیے چھاؤنی کا حکم رکھتا تھا اور لاہور کو لوٹ کر شمال کو جانے والے فاتح بھی پہلا پڑاؤ یہیں کرتے تھے۔حملہ آوروں،لٹیروں اور سپاہیوں کی ضروریات کے مدنظر بڑے بڑے تاجر،اعلیٰ درجے کی طوائفیں،شعلہ نفس گویے اور بذلہ سنج بھانڈوں کے طائفے بھی نور پور کے مستقل باشندے تھے۔زرگروں کا نور پور (ایمن آباد) سے گہرا تعلق تھا۔مہاراجہ شیر سنگھ کا ہندو خزانچی بھی نور پور کا رہنے والا تھا جس سے قرض لے کر گلاب سنگھ نے انگریزوں سے کشمیر خریدا تھا۔)''

اتنے سال گزر جانے کے باوجود آج بھی اس قصبے کے پرانے مکان محلے،گلیاں اور قدیم طرز تعمیر کے بوسیدہ نشانات اس کی قدامت اور عظمت رفتہ کی کہانی سناتے ہیں۔احمد بشیر نے اپنے آپ کو کشمیری پنڈتوں کی اولاد لکھا ہے۔ان کے جد امجد ایک فقیر کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔وہ پشمینے اور سن مرگ کا کچا نیلم لے کر لاہور آیا کرتے تھے۔جو اس زمانے میں ایسی اشیاء کی منڈی تھا۔۔۔ناول''دل بھٹکے گا (ص ۲۷)۔

۲۔ان کے مختلف مضامین اور ممتاز مفتی کے لکھے ہوئے خاکے سے بھی ان کا یہی خاندانی پس منظر اور ان کے جنم بھوم کی یہی تصویر ابھرتی ہے۔

۳۔احمد بشیر نے لاہور سے نکلنے والے ایک رسالے''عوامی جمہوری فورم''(نومبر ۲۰۰۳ شمارہ نمبر ۱۷) کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ ان کے بزرگ نارنگ منڈی سے ایمن آباد آئے تھے۔وہ برہمن کوشل تھے۔ان کا کہنا تھا کہ ان کے خاندان کی بزرگ خاتون کہتی تھی کہ وہ نارنگ منڈی میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ان کی ایک تائی

نارنگ منڈی جایا کرتی تھی مگر ان میں سے کوئی نارنگ منڈی نہیں گیا۔اسی انٹرویو کی رُو سے ان کے پردادا ہندو سے مسلمان ہوئے تھے۔ان کے والد سری نگر میں ٹیچر رہے تھے۔

۴۔ پروین عاطف نے اپنے گھر کے ماحول میں اپنی والدہ کی روشن خیالی اور اولاد کے ساتھ دوستانہ رویے کا ذکر کیا ہے۔احمد بشیر کے محسوسات اور پروین کے بیانات میں تضاد پایا جاتا جس سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

۵۔کشمیری لوگ ہر اس آدمی کو بجیب کہتے تھے جو کشمیر سے باہر سے آتا تھا۔دراصل یہاں کے لوگ بالعموم پنجابیوں سے خوفزدہ رہتے تھے جس کی وجہ ان کا ایک تلخ تاریخی تجربہ تھا۔مغلوں کے زمانے میں جہلم جھمب اور پونچھ کے راستے سے جو بھی حملہ آور وادی میں آئے اور جتنی بھی لوٹ مار ہوئی وہ پنجاب کی طرف سے ہوئی۔ہر چند کہ حملہ آوروں میں پٹھان۔افغان۔ڈوگر۔سکھ بھی شامل رہے مگر پنجاب کی طرف سے آنے کی وجہ سے وہ سب کو پنجابی ہی سمجھتے تھے۔۔''

بحوالہ ناول۔دل بھٹکے گا۔۔از احمد بشیر ص ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸

۶۔شیخ غلام حسین جس سکول میں ٹیچر تھے اس کا نام اسلامیہ سکول تھا۔اس میں اگر چہ ہندو اور سکھ بچے بھی پڑھتے تھے۔مگر اس پر عملداری مسلمانوں کی تھی۔چنانچہ مدیرالمہام کی طرف سے تقاضا ہوا کہ مسلمان ٹیچر کے لیے داڑھی لازم ہے۔شیخ صاحب نے مجبوراً داڑھی رکھ لی مگر اس عجیب وغریب تقاضے پر ان کا دل اس ملازمت سے اٹھ گیا۔انھوں نے پنجاب میں ملازمت کے لیے درخواستیں دینا شروع کر دیں اور جب ان کی ملازمت کا انتظام ہو گیا تو انھوں نے وہ مشروط داڑھی مونڈ کر اپنے استعفے کے ساتھ مدیرالمہام کو ارسال کر دی۔بحوالہ۔ناول ''دل بھٹکے گا'' اور خاکہ،احمد بشیر ''غنڈہ'' از ممتاز مفتی۔

۷۔احمد بشیر کا شخصی خاکہ بعنوان ''غنڈہ'' از ممتاز مفتی،مشمولہ در کتاب ''جو ملے سے راستے ہیں،ص: ۵۰

۸۔احمد بشیر حیات وادبی خدمات۔۔۔۔ریاض احمد ریاض

۹۔بحوالہ دل بھٹکے گا۔۔ص ۴۵۳...... نیز احمد بشیر کے خاکے ''غنڈہ'' میں ممتاز مفتی نے احمد بشیر کے ساتھ اسی سے ملتا جلتا مکالمہ تحریر کیا ہے۔صص: ۶۳، ۶۴

۱۰۔''میں اور احمد بشیر'' محمودہ بیگم کا طویل مضمون مشمولہ،کتاب ''دو تحریریں'' صص: ۸، ۹، ۱۰، ۱۱

۱۱۔احمد بشیر کی وفات پر سیلما میں منعقدہ ریفرنس میں پڑھی گئی مختصر خودنوشت۔

۱۲۔بشریٰ انصاری سے مصاحبہ

۱۳۔خط بنام محمودہ احمد بشیر،مشمولہ خطوں میں خوشبو،صص: ۳۸، ۶۲

۱۴۔ خط بنام مجید مشمولہ خطوں میں خوشبو۔۔ص: ۱۶۷

۱۵۔بحوالہ تعارفی کتابچہ فلم ''نیلا پربت''

۱۶۔فلم کی اداکارہ/مشہور رقاصہ پنّا (زرین سلیمان) نے گفتگو کے دوران احمد بشیر کی ان کیفیات اور احوال کا ذکر

تفصیل سے کیا جو فلمبندی کے دوران اداکاروں، خاص طور پر اداکاراؤں کے رویے کے باعث پیش آئے۔ سیٹ پر ان کا انداز فلم کے یونٹ کے ساتھ دوستانہ، بے تکلفانہ ہوا کرتا تھا۔ فلم کے گانوں پر رقص کے لیے انھوں نے پنّا کو خاص طور پر بک کیا تھا۔

۱۷۔ نکہی مفتی سے گفتگو

۱۸۔ مضمون از مجید احمد مشمولہ نیا زمانہ (نیا زمانہ۔۔ جس میں انھوں نے دمِ آخر تک لکھا، میں ان کی پہلی برسی پر ایک گوشہ شائع کیا۔ اس شمارے میں احمد عقیل روبی، نیلم بشیر، احمد مجید کے مضامین کے علاوہ بیٹے کے نام لکھا گیا احمد بشیر کا ایک خط بھی شامل ہے)۔

۱۹۔ خط بنام مجید مشمولہ خطوں میں خوشبو ص:۱٦۸، سید سبط الحسن ضیغم، زاہد عکاسی اور مختلف معاصرین سے گفتگو۔

۲۰۔ مضمون ''وقت بہتا دریا'' از زاہد عکاسی مرحوم، مشمولہ ماہنامہ ''نیا زمانہ'' فروری ۲۰۰۵ لاہور۔ (ان حالات و واقعات کا تذکرہ احمد بشیر کے خطوط، مضامین اور ان کے سوانحی ناول، ''دل بھٹکے گا'' کے صفحات پر بھی ملتا ہے) نیز نکہی مفتی سے مصاحبہ

۲۱۔ فلمساز و ہدایتکار: احمد بشیر، کوریوگرافی: خوشنود سرات، موسیقی: سلیم اقبال، معاونین: زاہد عکاسی، مسرت پراچہ، سٹل فوٹو گرافر: مقبول، پروڈکشن کنٹرولر: ارشد، یہ پاکستان میں بننے والی پہلی اور آخری فلم ہے جس میں کوئی مکالمہ نہیں تھا صرف رقص کے ذریعے کہانی بیان کی گئی تھی۔ بحوالہ ''وقت بہتا دریا'' مشمولہ، نیا زمانہ لاہور، ص:۵۷

۲۲۔ مضمون ''وقت بہتا دریا'' از زاہد عکاسی مرحوم، مشمولہ ماہنامہ ''نیا زمانہ'' فروری ۲۰۰۵ لاہور۔ نیز ان حالات و واقعات کا تذکرہ احمد بشیر کے خطوط (بنام مجید صص: ۱٦۸، ۱٦۹)، مضامین اور ان کے سوانحی ناول، ''دل بھٹکے گا'' کے صفحات پر بھی ملتا ہے۔

۲۳۔ محمودہ بیگم، فرخ سعید و دیگر سے مصاحبہ۔ نیز خود احمد بشیر نے اپنے ایک طویل انٹرویو میں انھی خیالات کا اظہار کیا۔ (انٹرویو مشمولہ عوامی جمہوری فورم شمارہ ۱۷) شاد گیلانی کا ذکر خط بنام ہمایوں، ص:۹۳ خط بنام مجید ص:۱۹۵، اختر امرتسری کا ذکر انھوں نے اپنے ایک خط بنام ممتاز مفتی میں بھی کیا ہے۔ ص:۱۴۷

۲۴۔ ہندوستان کے سفر میں معروف رقاصہ پنّا (زریں سلیمان)، رسول بخش پلیجو، زاہد عکاسی اور فخر زمان ان کے ہمراہ تھے۔ نیلم احمد بشیر نے یہ مخطوطے اور کتب پنجابی انسٹیٹیوٹ قذافی سٹیڈیم لاہور کے کتب خانہ کے سپرد کر دی ہیں۔ راقم نے دوران تحقیق ان تمام دستاویزات، مخطوطوں اور کتب کا مشاہدہ کیا ہے۔

۲۵۔ خط بنام عباس ص:۱۰٦

۲٦۔ خاکہ احمد بشیر بعنوان ''بابل مورا'' (سابقہ عنوان: ابا پیا)

۲۷۔ کرنل عباس سے مصاحبہ

۲۸۔ میں اور احمد بشیر مشمولہ دو تحریریں، ص: ۳۶

۲۹۔ محترمہ محمودہ بیگم نے "میں اور احمد بشیر" میں تاریخ وفات ۲۳۔ دسمبر لکھی ہے۔

۳۰۔ مضمون "کچھ باتیں کچھ یادیں، از سرفراز سید مشمولہ نیا زمانہ فروری ۲۰۰۵) ص: ۳۹

۳۱۔ روزنامہ "جنگ" لاہور، ۲۸ دسمبر ۲۰۰۴ ۔

۳۲۔ ایضاً ادبی ایڈیشن ، ۷۔ جنوری ۲۰۰۵ء ۔

۳۳۔ تعزیتی ریفرنس منعقدہ ۱۹ جنوری ۲۰۰۵ء بمقام آواری ہوٹل لاہور

۳۴۔ پروگرام "خراجِ تحسین" میزبان، انور مقصود، پیشکش پاکستان ٹیلی وژن نیٹ ورک اسلام آباد

احمد بشیر کی حیات کے چند پہلو

احمد بشیر کی شخصیت ان کے خاندان کے افراد کے مزاج اور رویوں اور اس ماحول سے، جو انھوں نے اپنے درون خانہ رشتوں کو دیا، سے مترشح ہے۔ کیونکہ انسان کی شخصیت کا مطالعہ اس کے دورون خانہ اور بیرون خانہ کردار اور مختلف مواقع پر پیش آنے والے واقعات سے وابستہ سلوک رویوں کے ساتھ مکمل ہوتا ہے۔ اس لیے آئندہ صفحات میں ان کی شخصیت کا مطالعہ؛ درون خانہ، بیرون خانہ اور کہتی ہے تجھ کو خلق خدا کے ذیلی عنوانات کے تحت کیا جا رہا ہے۔

احمد بشیر درون خانہ

احمد بشیر نے ازدواجی سفر آغاز کرنے سے پہلے محمودہ بیگم کو اپنے پہلے خط میں لکھا تھا۔ ''تم پریشان نہ ہو میری زندگی میں تم ایک قندیل کی طرح ہو۔ میں اسے کبھی بجھنے نہیں دوں گا۔'' (۱) خط کے نیچے لکھا تھا ''تمھارا احمد بشیر'' احمد بشیر کی شخصیت کے باب میں یہ خط ان کی شخصیت کے اس پہلو کو اجاگر کرتا ہے کہ وہ دھن کے پکے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محمودہ بیگم ان کی زندگی میں قندیل کی طرح جلتی رہی، روشنی کرتی رہی۔ وہ مجلسی آدمی تھے۔ نہ صرف اپنے ہاں بلکہ دوسروں کے ہاں بھی جہاں لوگ انھیں بلاتے وہ شوق سے جایا کرتے تھے۔ عام طور پر مجلسی آدمی کی گھریلو زندگی اور اس کے اہل خانہ بُری طرح نظر انداز ہوتے ہیں۔ مگر احمد بشیر کہ جن کی زندگی رویوں میں عدم توازن اور عملی طور پر افراط و تفریط کے مظاہر سے بھری پڑی ہے مگر اس کے باوجود وہ اپنے آدرشوں اور فکری عقائد کے حوالے سے ایک منظم شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں تو اس میں محمودہ بیگم کے کردار اور قربانیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف احمد بشیر نے بھی جو لکھا تھا، تمھارا احمد بشیر، ساری زندگی اسی کا ہو کے رہا۔ اگر چہ ایک بار دل بھٹکا بھی مگر چند ہی دنوں بعد سیدھی راہ پر آ گیا۔ (۲)

احمد بشیر کو اللہ تعالیٰ نے چار بیٹیوں (نیلم، سنبل، بشریٰ، قلزم) اور ایک بیٹے (ہمایوں شیخ)

سے نوازا۔ کیونکہ وہ روایت شکن تھے۔ اس لیے انھوں نے اوپر تلے چار بیٹیوں کی پیدائش پر کبھی کسی تأسف یا محرومی کا اظہار نہیں کیا بلکہ وہ اپنی بیٹیوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کو انھوں نے مکمل آزادی دی اور بیٹوں کی طرح پالا۔ میاں بیوی میں پیار اور بیوی میں خاوند کی اطاعت اور اس پر بھروسہ مثالی تھا۔ اولاد پر کبھی اپنی پسند عائد نہیں کی۔ بیٹیوں کا جو جی چاہا انھوں نے پڑھا۔ جب بیٹیوں کی شادی کی باری آئی تو ان کی شادیاں بڑی سادگی سے مسنون طریقے سے کیں۔ ان کی بیٹیاں آج بھی آپس میں شیر و شکر ہیں۔ یہ سعادت مند بیٹیاں ہیں جن کو اپنی والدہ کے اکیلے رہ جانے کا شدت سے احساس ہے چنانچہ وہ اپنی اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر اپنی والدہ کو اپنے قرب میں رکھتی ہیں۔ اکثر اپنے ابا کو یاد کرتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ابا کے بعد زندگی میں ایک خلا ہے جو کبھی پُر نہیں ہوگا۔ احمد بشیر نے اپنی بیٹیوں کی شادیاں کرتے وقت کوئی دنیوی معیار نہیں دیکھا۔

نیلم احمد بشیر

اردو اور پنجابی کی نامور افسانہ نگار اور اردو پنجابی کی شاعرہ ہیں ادیب ہیں۔ ان کے افسانوں کے پانچ مجموعے، جگنوؤں کے قافلے، ستمگر ستمبر ایک تھی ملکہ، لے سانس بھی آہستہ، وحشت ہی سہی اور خاکوں کا مجموعہ چار چاند زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں اور ایک ناول زیر طبع ہے۔ ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ سب شادی شدہ ہیں اور امریکہ میں مقیم ہیں۔ نیلم احمد بشیر اپنے ابا کی قلمی، علمی اور فکری وارث ہے۔ ان کی زندگی میں بھی نیلم ان کی پرسنل اسسٹنٹ کے طور پر ان کی خدمات انجام دیتی تھی؛ دفتری امور، کسی کتاب کی اشاعت کے لیے فالواپ، پبلشروں سے معملہ کرنا کسی فنکشن پر لے جانا، یہ سب انھیں کی ذمہ داری ہوا کرتی تھی۔ ان کی تحریروں میں بھی اپنے ابا کا رنگ جھلکتا ہے۔

سنبل شاہد

گلوکارہ اور اداکارہ ہے۔ ٹی وی پروگراموں کی اینکر بھی ہیں مگر وہ بشریٰ انصاری کے برعکس، گھرداری سے فارغ ہونے کے بعد کافی دیر بعد اس شعبے میں آئیں۔ متعدد ٹی وی ڈراموں میں ثانوی کردار ادا کر رہی ہیں ان کے میاں شاہد ریٹائرڈ آرمی آفیسر ہیں۔ سنبل کے دو بیٹے ہیں۔ بقول نیلم "سنبل سائل زیست میں گھری بے بس شہزادی ہمیشہ ابا کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔۔۔۔ آخری سانس تک انھیں سنبل کے حالات کی یکسانیت نے پریشان رکھا اور اسی فکر میں وہ دوسری دنیا کو روانہ ہو گئے۔"

بشریٰ انصاری

پاکستان کی نامور ہمہ وقت اور ہمہ جہت اداکارہ، گلوکارہ اور معروف ڈرامہ نگار ہے۔ شوخ و چنچل باتونی گوپی کو احمد بشیر پیار سے میری طوطی کہا کرتے تھے۔ کسی نے بھی ابا سے کوئی بات منوانا ہوتی یا کوئی کام نکلوانا ہوتا تو اس کے لیے بشریٰ ہی کو ابا کے سامنے بھیجا جاتا۔ کیونکہ احمد بشیر اپنی 'گوپی' کی بات نہیں ٹالتے تھے۔ بشریٰ انصاری دو بیٹیوں (میرا انصاری، نرمان انصاری) کی ماں ہیں۔ دونوں شادی شدہ ہیں۔ بشریٰ کے شوہر، اقبال انصاری مشہور ٹی وی پروڈیوسر اور ڈراما ڈائریکٹر ہیں۔

اسماعباس

احمد بشیر کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔ انھوں نے پہلے اس کا نام قلزم رکھا۔ ویسے تو احمد بشیر نے اپنی سب بیٹیوں سے جی بھر، عمر بھر پیار کیا مگر چھوٹی ہونے کی وجہ سے اسماء سے انھیں خاص محبت تھی۔ وہ 'ابا کی ماؤں بلی' تھی۔ وہ اسے پیار سے مانو کہا کرتے۔ احمد بشیر کی مانو سے سب پیار کرتے ہیں۔ کیونکہ اس نے اپنی زندگی میں آنے والے طوفانوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے۔ اسی لیے احمد بشیر اسے کبھی بی بی رابعہ بصری بھی کہہ کر بلایا کرتے اور کبھی اس کی معصوم چالاکیوں پر پیار سے کہتے۔ ''تو میری ماں ہے''۔ نیلم 'ابا پیا' میں مانو کا کردار اجاگر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> '' وہ خوبصورت کپڑے زیور پہن، سج بن کر ابا کے کمرے میں پائل چھنکاتی داخل ہوتی تو ابا مسکرانے لگتے۔ وہ دروازے کے پیچھے سے 'جھا' کر کے انھیں اپنی چھب دکھا کر دیوانہ بنا دیتی۔ وہ اس سوتی جاگتی گڑیا جیسی بیٹی پر بری طرح فریفتہ تھے اور مانو کو بھی ان سے اتنا ہی پیار تھا کہ اس نے شادی کے بعد بھی ان سے علیحدہ ہونا گوارا نہ کیا اور عباس کی رضامندی سے اپنے ماں باپ کو گھر میں ہی رکھ لیا۔''

اسما کے شوہر کرنل عباس گل، اپنے سسر کی ناک کا بال تھے۔ اسما، فلم ٹی وی اور سٹیج کی معروف اداکارہ ہے۔ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی ماں ہے۔ ویسے تو ساری بیٹیاں اپنے ابا کو یاد کرتی ہیں۔ دوران گفتگو ان کا تذکرہ لے آتی ہیں مگر مانو کیونکہ ان کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی تھی وہ اکثر ابا کو یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ابا کے بعد اب دنیا میں جی نہیں لگتا۔ ممتاز مفتی کہا کرتے تھے کہ ''احمد بشیر کے جینز کا جوار بھاٹا ان لڑکیوں کو چین نہیں لینے دے گا'' یہ بات بالکل سچ ثابت ہوئی۔ احمد بشیر اور محمودہ بیگم کی یہ بیٹیاں رائٹر، اداکار، ہدایتکار، گلوکار، اور آرٹ اور کلچر میں اپنی اپنی شناخت رکھتی ہیں۔

ان کا واحد بیٹا جس سے احمد بشیر کو بہت پیار تھا۔ ہمایوں نے ہوٹل مینجمنٹ میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد ایک طویل عرصے سے امریکہ میں مقیم ہے۔ آئندہ ابواب میں احمد بشیر اور ہمایوں بشیر کے درمیان خط وکتابت احمد بشیر کے بطور باپ کردار کو واضح کرتی ہے۔ احمد بشیر کی زندگی میں بیرون خانہ اور درون خانہ ایک خوشگوار توازن پایا جاتا تھا۔ اپنی بہنوں بھائیوں سے ان کا میل ملاپ، ان کی سرپرستی، اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت اور ان سے برتاؤ ایک مثالی بھائی اور باپ کی تمثیل ہے۔

شادی سے پہلے احمد بشیر کے حالات کا سراغ ان کے خطوط، ممتاز مفتی کے ان پر لکھے گئے خاکے اور خود ان کے خطوط کے علاوہ ان کے ناول سے بھی ملتا ہے۔ مگر ان کے درون خانہ احوال، طبیعت اور عادات واطوار کی واحد راوی اور شاہد ان کی ہمشیرہ بیگم پروین عاطف ہی ہیں۔ پروین سے احمد بشیر کو بہت پیار تھا۔ انھوں نے پروین کی تعلیم وتربیت میں اپنی تمام کمیوں اور معذوریوں کو مشعلِ راہ بنایا۔ جب میٹرک کے بعد ان کے والدین نے ان کی تعلیم کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے اسے گھر بٹھا کر اس کے رشتے کے لیے سوچنا شروع کر دیا تو احمد بشیر بہانے سے اسے لاہور لے آئے۔ (انھوں نے عاطف کے خاکے میں لکھا ہے کہ وہ بھاگ کر لاہور میرے پاس آ گئی) اور اسے مدرسۃ البنات میں داخل کروا دیا۔ پروین نے ایم اے تک تعلیم حاصل کی اور آخرش انھی نے پروین کے لیے عاطف کو پسند کیا اور ان کی شادی کی۔ پروین بہن بھائی کے پیار کی داستان سناتی ہوئی کہتی ہیں:

> ''بھائی جان مجھ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ مجھے ہر وقت ساتھ رکھتے تھے۔ میں تب چھوٹی سی تھی۔ وہ امتحانوں کے دنوں پڑھنے کے لیے باہر جا کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر پڑھا کرتے۔ وہ مجھے ساتھ لے جاتے۔ میں کھیلتی رہتی اور وہ پڑھتے رہتے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مجھے کھیلتے دیکھتے اور مسکرا کر پھر پڑھنے میں مصروف ہو جاتے۔ میں رات انھی کے ساتھ سوتی۔ کشمیر میں زلزلے بہت آتے تھے۔ میں بہت ڈرتی تھی۔ جب زلزلہ آتا تو بھائی خرمستیاں کرنے لگتے اور اٹھ کر پلنگ پر اچھلنا کودنا شروع کر دیتے اور یوں مجھے یہ باور کروانے کی کوشش کرتے۔ چارپائی کے ہلنے کی وجہ ان کی اچھل کود ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے اور ان کے جانے کے بعد بھی مجھے تو یوں لگتا تھا کہ وہ میرے بھائی ہی نہیں میرے باپ ہیں۔ انھوں نے بھی مجھے اپنی بیٹیوں کی

طرح ہی رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ نیلم، بشریٰ، سنبل اور قلزم نے مجھے کبھی پھوپھی نہیں کہا بلکہ وہ سب مجھے پنی باجی کہتی ہیں۔"(۳)

احمد بشیر کا ایک بھائی جو بہت مرنجاں مرنج، مزاح نگار، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کافی عرصہ لندن میں بھی رہا تھا۔ احمد بشیر کے دل میں وہ بیٹوں کی طرح رہتا تھا۔ ایک رات پچھلے پہر اچانک اختر عکسی کو سینے میں شدید درد محسوس ہوئی۔ احمد بشیر کے چھوٹے بھائی اختر عکسی کا بہن بھائیوں میں تیسرا نمبر تھا۔ احمد بشیر دیگر بہن بھائیوں کی طرح اسے بھی حرزِ جاں رکھتے تھے۔ وہ اختر عکسی کو بدقت ہزار ہسپتال لے گئے مگر صبح ہونے تک اس کی روح ذرہ ذرہ اس کے جسم سے نکل چکی تھی بعد میں پتہ چلا کہ اختر کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ بشریٰ انصاری راوی ہیں کہ زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ ابا کو اس قدر دل گرفتہ اور بدحواس دیکھا۔ ان کو اس جواں مرگ نے اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ ایک عرصے تک انہیں اختر کی موت کا یقین ہی نہ آیا۔ وہ اکثر گھر کے کمروں میں اسے ڈھونڈتے رہتے۔ پھر انہیں اچانک یاد آتا کہ وہ خود اسے کرشن نگر کے قبرستان میں ایک قبر میں اتار کر آئے تھے۔ بشریٰ انصاری بتاتی ہیں کہ وہ وقت ابا پر بہت مشکل وقت تھا ان کا رونا تڑپنا اور کار کے دروازے میں ہاتھ دے دینا، مجھے سب کچھ یاد ہے۔(۴)

احمد بشیر اور ان کے بیٹے کے درمیان ساری زندگی اسی بات پر ٹھنی رہی کہ انھوں نے زندگی میں جو کچھ بھی کیا وہ بے سود تھا۔ انھوں نے اپنے رویوں کے باعث جو بھی کیا وہ ان کے لیے تو تسکین کا باعث ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ انسانیت بھی اس پر رشک کرتی ہو مگر نتیجہ یہ ہے کہ ان کے انہی افکار اور اعمال نے انکے اپنوں کو، ان کے دست نگروں کو کوئی سکھ اور تسکین نہیں دی۔ شروع میں تو باپ بیٹے میں خوب مباحث ہوا کرتے تھے۔ احمد بشیر نے ہمیشہ اپنے بیٹے کے زندگی کے بارے میں مؤقف اور رویے کو بدلنے پر دلائل دے کر اسے زندگی کا اصل آدرش اور چہرہ دکھانا چاہا مگر شاید وہ یہ بات بھول چکے تھے کہ زندگی کا ایک چہرہ ان کے والد نے بھی انہیں دکھانے کی کوشش کی تھی۔ مگر انھوں نے اسی عینک سے زندگی کے آدرش اور مقاصد اور اس کی تصویر بنائی جو انکے اپنے ہنر کا شاہکار تھی انھوں نے اپنے باپ کی بنائی ہوئی زندگی کی تصویر کو دیکھ کر ماننے اور پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ اب ان کے سامنے، مکافات کا عمل تھا۔ گنبد کی صدا تھی۔ جسے وہ سن رہے تھے سمجھ نہیں رہے تھے۔ یا وہ سمجھا نہیں پا رہے تھے۔ شاید شیخ غلام حسین بھی اپنے بیٹے کی باتوں کو نہ سمجھا تھا اور شاید انھوں نے سمجھنے کی کوشش بھی نہ کی تھی مگر آخر کار احمد بشیر کو، بادل نخواستہ یہ بات سمجھ آگئی تھی۔ ان کے ملال میں اس اعتراف کی جھلک بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔" ساری دنیا نے مجھے مانا مگر میرے باپ اور میرے بیٹے نے مجھے نہ مانا۔ نہ مجھے میرے باپ نے

سمجھا اور نہ ہی میرے بیٹے نے مجھے سمجھا۔" قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔تمہاری اولاد اور مال تمہارے لیے فتنہ ہیں۔احمد بشیر زیرک تھے کہ ایک فتنے یعنی مال سے تو جان بچا گئے کہ انہیں کبھی دولت کا لالچ نہیں رہا۔مگر اولاد کے فتنے سے نہ بچ سکے۔بیٹے کی محبت میں انھوں نے بیٹے کو بطریق ہزار قائل کرنے کی کوشش کی کہ تمہارا باپ بے وقوف نہیں غیر معمولی انسان ہے۔احمد بشیر کا ہمایوں کے نام مکتوب اسی خیال کو تقویت دیتا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

> "کاش کہ تم نے اپنے بوڑھے بابا پر طنز کرنے اور اس کی جہالت پر رحم کھانے کی بجائے کچھ پوچھا ہوتا۔تمہیں پتہ ہے کہ میں شیخی نہیں مارتا۔اپنے آپ کو ادنیٰ آدمی سمجھتا ہوں۔مگر تمہاری اطلاع کے لیے عرض کروں کہ میرے پاس بیٹھنے والے عالم فاضل کہلاتے ہیں۔تم نے کچھ جاننا چاہا ہی نہیں، اور یہ میں تو ایک ہفتے کے بعد ہی سمجھ گیا تھا کہ تمہارے آگے بولنا منع ہے اور چپ رہنے کا عادی ہوں کیونکہ میں کسی کو ناراض کرنا نہیں چاہتا اور بیٹے کو جو میرے کلیجے کی ٹھنڈک ہو، کبھی بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا مگر تم شاید اللہ کو وجودی ہستی سمجھتے ہو، کوئی جذباتی قوت سمجھتے ہو جو عمرہ کرنے سے خوش ہوتی ہے اور کعبے سے باہر نکلتی ہی نہیں۔۔خیر یہ باتیں کمزوری کی علامت ہیں اور اللہ قادر مطلق ہے وہ کمزور ہو کر انسان کی سطح پر نہیں آ سکتا۔وہ خالق اعلیٰ ہے وہ تخلیق کا اصول ہے وہ اس دور میں بھی تھا جب کعبے میں ۳۶۰ بت پوجے جاتے تھے۔۔۔۔۔"

انھیں برعظیم کے مشاہیر کی صحبتیں بھی میسر آئیں اور وہ ان ملاقاتوں کو قابل فخر سرمایۂ حیات سمجھتے تھے۔اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

> "میں نے یہ خط جو ملفوف ہیں، روک لیے تھے کیونکہ ڈرتا تھا کہ تم ناراض ہو جاؤ گے اور میں کسی کو ناراض نہیں کرتا۔اس لیے تم نے مجھے زندگی میں ہر ایک کے آگے چپ ہی دیکھا ہوگا۔ماں باپ کے آگے، بہن کے آگے، بیوی کے آگے، نیلم کے آگے اور تم سب کے آگے۔یہ نہیں کہ تم لوگ مجھے لاجواب کر دیتے بلکہ اس لیے کہ تم سب کے سب سمجھتے ہو کہ تم حق و باطل کے راز دار ہو اور میں ایک بیوقوف بوڑھا جاہل آدمی ہوں جس نے نہ کوئی مکان بنایا نہ زندگی میں کچھ حاصل کیا۔چلو یونہی سہی! میں نے زندگی میں جو لڑائی لڑی ہے،

اس کا احساس کسی کو نہیں۔ بعض لوگ بغاوت کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر چہ سب کامیاب نہیں ہوتے مگر بغاوت میری ذاتی آسودگی و آسائش کے لیے نہیں تھی بلکہ مخلوق کی آسودگی اور آسائش کی خاطر تھی اور میرے بعد اور لوگ بھی تاریک گلیوں میں مارے جائیں گے۔ اور ہر عمل چلتا رہے گا۔ جب انسانیت غم اور بھوک سے آزاد نہیں ہو جاتی۔ کیا اللہ اللہ کرنے کے کچھ اور معنی بھی ہو سکتے ہیں؟ میں ہاتھ پیر ہلانے کے قابل نہیں۔ تیس برس سے مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوں مگر ایک عذاب نا قابل بیان ہے اور جو یہ ہر گھڑی دن رات مسلسل میرے پیر جلتے ہیں جیسے انگیٹھی پر رکھے ہوں۔ اگر تمہاری انگلی پر ریشمی دھاگہ باندھ دے تو تیس برس کے بعد تم انگلی کٹوانے پر تیار ہو جاؤ گے۔ میں اس مسلسل اذیت کے باوجود چڑ چڑا نہیں ہوں۔ لوگوں سے جھگڑا نہیں کرتا۔ کسی بات کی شکایت نہیں کرتا اور سیلف کنٹرول کو نہیں چھوڑتا۔ تم تو میرے پیارے بچے! ایک منٹ میں بھڑک جاتے ہو۔ فتوے دینے لگتے ہو اور کسی کو شک کا فائدہ بھی نہیں دیتے، خاص طور پر مجھے۔۔۔۔۔۔ اگر کچھ میں نے اتنا کہہ دیا ہو جو مجھے نہیں کہنا چاہئے تھا یا جو تمہاری طبیعت پر ناگوار گزرے تو مجھے ایک بیوقوف بوڑھا سمجھ کر معاف کر دینا۔ آدمی سب کچھ کر سکتا ہے مگر اپنی ولدیت نہیں بدل سکتا۔۔" (۵)

مندرجہ بالا خط سے احمد بشیر کی شخصیت کا جو پہلو سامنے آتا ہے۔ وہ ان کی صحافتی اور ادبی تحریروں میں عنقا ہے۔ جو یہ کہتا ہو کہ جب میرے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے تو میں خود کو محاذ جنگ پر کھڑا سمجھتا ہوں۔ وہی شخص جب قلم ہاتھ میں لے کر اپنے بیٹے کو خط لکھنے بیٹھتا ہے تو قلم کی تیز دھار کند ہو جاتی ہے اور وہ تلوار سے ڈھال کر کام لینے لگتا ہے۔ درون خانہ اس کی شخصیت بالکل بدل جاتی ہے۔ وہ اپنی بیوی کے لئے رحمت کی چھتر چھایا ہے۔ اولاد کے لئے ایک مشفق باپ۔ دوستوں کے حلقے میں، سرکار اقتدار کے سامنے کبھی نہ ہار ماننے والا نڈر اور دلیر، قلندر منش احمد بشیر اپنی اولاد کے سامنے کسی گنہگار کی طرح اپنے ہر ہر عمل کا حساب اپنی صفائی کی صورت میں دیتا دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ وہاں وہ احمد بشیر نہیں بلکہ ایک باپ ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی معترض اور مختلف سوچ رکھنے والا اسے احمد بشیر کی دوعملی یا دوغلا پن کہے مگر درحقیقت یہی احمد بشیر کی شخصیت کے اس خاصے پر دلیل ہے جسے ہم نے ان کی شخصیت کے توازن کا نام دیا ہے۔ ان کی شخصیت مختلف رنگوں

سے مل کر بنی ہوئی تھی۔ نیلم احمد بشیر اپنے ابا کی شخصیت کے اس پہلو پر یوں رقمطراز ہیں:

''ابا ہماری زندگیوں کا مرکز اور ہماری فیملی کے بے تاج بادشاہ تھے ہم سب میں اگر کسی ٹیلنٹ کی کوئی بھی پر جمال پچکاری نظر آتی ہے تو وہ انہی کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے فنون لطیفہ کی قدر کی اور ہمیں اسے زندگی میں برتنے کا ذوق بخشا جو زندگی کو خوبصورت بنانے کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ امی کو ایک سیدھی سادی گھریلو بیوی کے باوجود کلاسیکی موسیقی کی تعلیم دلوانا، بہن پروین کی تحریروں کو سراہنا اور مزید سیکھنے کی تلقین کرنا بشریٰ کے فن کی پذیرائی کرنا، بیٹیوں کو محاذ زندگی پر بہادری سے ڈٹے رہنے کی تربیت کرنا انہی کا کام تھا۔ ابا نے ہمیں عورتیں سمجھ کر نہ کم تر سمجھا نہ محکوم۔ ورنہ جس معاشرے میں ہم سانس لیتی ہیں اس میں کوئی مائی کا لال عورت کو اس کی ہستی اور ٹیلنٹ کے اظہار کی غلطیاں کرنے اور پھر ان سے سیکھ کر زندگی کو بہتر بنانے کا شعور نہیں دیتا۔ انھوں نے ہمارے اچھے برے فیصلوں میں ہمیں تنہا نہ چھوڑا۔ ہم نے اپنے اپنے دکھوں کی پوٹلیاں اٹھائیں اور ان کے پیروں میں جا پھینکیں۔ ان کے گھٹنے سے لگ کر آنسو بہائیں کہ وہ دکھ آشنا تھے۔ حکم دینے والے باپ نہیں تھے۔''(۶)

احمد بشیر نے اپنی بیٹیوں اور بہن کو اور اپنی بیوی کو عورتیں سمجھ کر ان کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو ہمارے معاشرے میں عورت کے ساتھ کسی سطح پر نہیں ہوتا۔ بہن ہے تو بھائیوں کی دست نگر۔ ان سے پوچھ کے ان کی مرضی سے چلتی ہے۔ بیٹی ہے تو باپ کی مرضی کی پابند ہے اور بیوی اور بہو کی تو خیر بات ہی اور ہے۔ بقول نیلم احمد بشیر، ان کے اکلوتے بھائی اور ابا کے لاڈلے کو ابا کے دیگر افکار و اعمال کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی اعتراض تھا کہ ان کی بیٹیاں (میری بہنیں) عام روایتی عورتوں سے مختلف کیوں ہیں۔ باپ بیٹے میں فکری سطح پر زندگی بھر ٹھنی رہی۔ مگر احمد بشیر محبت کا وہ سمندر تھا جس کی محبت آگیں لہریں اپنی چاروں گوپیوں، پیاری پروین عاطف، بیٹے ہمایوں کو۔۔۔ اور آخری لمحے تک ان کی زندگی اور ان کے ہر آدرش کی شریک محمودہ خانم عرف مودی کو بھی سیراب کرتی رہیں۔ ان کی خودسر طبیعت اور بے لحاظی کی حد تک حق گوئی کے باعث ان کے گھر والے اکثر معاشی اور معاشرتی سطح پر مشکلات میں رہے اگر احمد بشیر بیرون خانہ پورے قد سے اپنے آدرشوں کے ساتھ کھڑے رہے تو اس

کی بہت بڑی وجہ ان کی اہلیہ محمودہ خانم اور ان کی اولاد کا ایثار اور توکل تھا۔ بقول نیلم بشیر:

''ابا کو احمد بشیر بنانے میں ہماری ماں کا بہت ہاتھ ہے انھوں نے روایتی بیویوں کی طرح اپنے من موجی شوہر سے کبھی سونے، ہیرے کے گہنے، کوٹھی بنگلہ گاڑی بینک بیلنس کا مطالبہ نہ کیا۔ ہر حال میں خوش رہیں اور صحیح معنوں میں ان کا ساتھ دیا۔ ابا نے کمایا لٹایا ضائع کیا ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ یا ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی سے چھلانگ مارنے نکل کھڑے ہوتے۔ امی کو کبھی اعتراض نہ ہوا۔ انھوں نے ابا کے فیصلوں پر اعتماد کیا اور زندگی کے ایڈونچر میں ان کے ہمرکاب رہیں۔ انھوں نے اپنی اور اپنے شوہر کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو ہمیشہ ایک نیا تجربہ سمجھ کر خوش آمدید کہا اور کبھی اعتراض نہ کیا۔''(۷)

اولاد عجیب چیز ہے۔ اس کے ظلم پر انسان احتجاج اور مدافعت کرنے کے بجائے اس پر تلملا کر بھی مچل مچل جاتا ہے۔ دنیا کے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہونے والا بڑے آرام سے سپردگی اور رضامندی سے اولاد کے سامنے ڈھے جاتا ہے۔ یہی حال احمد بشیر کا تھا۔ ان کی بیٹی سنبل کہتی ہیں:

''احمد بشیر نے گھر سے باہر کبھی کسی سے Compromise نہیں کیا، کبھی کسی کی غلط بات کو درگزر نہیں کیا، کبھی کسی کے سامنے کمزور نہیں پڑے سچی اور کھری بات کرتے وقت کبھی کسی کا لحاظ نہیں کیا اور ہمیشہ اپنے Point of view پر ڈٹے رہے لیکن ہمارے ابا احمد بشیر نے اپنی بیٹیوں کے ساتھ ہر بات میں Compromise کیا۔ چاہے بات صحیح ہو یا نہ ہو۔ وہ ہمیشہ ہمارے پیار میں بھیگی بلی بنے رہے۔ ہم بیٹیوں میں سے کوئی بیٹی اگر دو چار دن انہیں ملنے نہ جاسکتی تو آنکھوں میں آنسو لیے اس کے بارے میں پوچھتے پھرتے اور جب وہ بیٹی اچانک ان کے سامنے آجاتی تو شکر کرتے اور بڑی نرم اور پیار میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھتے ''یار توں کتھے چلی گئی سیں'' اس وقت ان کو دیکھ کر لگتا کہ ان سے زیادہ کمزور آدمی کوئی ہے ہی نہیں۔ لیکن وہ کمزور آدمی احمد بشیر نہیں تھا، بلکہ وہ ہمارے پیارے ابا تھے، جو اپنی بیٹیوں کے پیار میں ایسے ہو جاتے تھے۔''(۸)

نیلم احمد بشیر کے لکھے ہوئے خاکے ''ابا پیا'' میں اس امر کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں اپنی بیٹیوں سے کس طرح کا پیار تھا اور اس کے اثرات ان کی زندگیوں پر کس طرح ظاہر

ہوئے۔احمد بشیر کے جانے کے بعد بھی کیفیت، رفتید و لے نہ رفتید از دل ما، والی کیفیت ہے۔اس کا اظہار" ابا پیا" کی ان سطور سے ہوتا ہے:

> "ابا ہم سب بیٹیوں اور دیگر اہل خانہ کی شخصیات میں پھسکڑا مار کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ان کی شخصیت ہم میں یوں گھل کر اتر چکی ہے جیسے چائے میں چینی۔کئی بار جب میں عینک لگا کر سنجیدگی سے کچھ پڑھ رہی ہوتی ہوں تو میرے بچے کہہ دیتے ہیں۔' بالکل بڑے ابا لگ رہی ہیں۔ بشریٰ جب کسی کو قائل کرنے کے لیے پر جوش انداز میں دلیلیں دینے لگتی ہے تو سنبل یہ کہہ کر ہنسا دیتی ہے کہ' بس کریں بشیر صاحب'۔عباس جب ٹی وی پہ مستقلاً خبریں ہی دیکھتا چلا جاتا ہے تو مانو کہہ دیتی ہے۔' بالکل ابا ہی بنتا جا رہا ہے۔"

اپنی زندگی کی آخری دہائیوں میں احمد بشیر کا عباس کے ساتھ خوب جی لگا۔ بلکہ ان کے اس لاڈلے داماد نے خود کو اپنے محبوب سسر سے یوں منسلک کیا کہ ندیم دوست سے بوئے دوست والا معاملہ ہے۔کرنل عباس کئی موقعوں پر اپنے سسر کا پرتو لگتا ہے۔اسی لیے بشریٰ اکثر کہتی ہیں۔" عباس! تمہاری عادتیں اور طبیعت دیکھ کر تمہیں عباس (Abbas) کے بجائے ابا (Abba) کہنے کو جی چاہتا ہے۔"

بیرون خانہ

احمد بشیر کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد اور خود متعدد مضامین میں ان کی اپنے نظریات کے بارے میں وضاحت کے بعد یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ان کا پاکستان یا ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی یا انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہی وہ اس کے رکن یا کارکن رہے۔مگر بالشویک حکماء اور بالشویک تحریک کا اور اشتراکی جدوجہد کی تاریخ کا ان کا گہرا مطالعہ تھا۔جس کا اظہار ان کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ان کی ترقی پسندی ایک اعتبار سے علامہ اقبال کی ترقی پسندی کا عکس کہی جا سکتی ہے کیونکہ ان کا قلم بھی اقبال کی طرح سرمایہ دارانہ فرسودہ نظام اور دین ملا کے خلاف لکھتا رہا۔وہ پاکستان کے وجود کو ناگزیر اور علامہ اقبال اور قائداعظم کی سیاسی بصیرت اور اخلاص کے دلائل و براہین کے ساتھ معترف تھے۔پاکستان میں فوج کے سیاست میں کردار نے فوج کو بحیثیت ادارہ بہت نقصان پہنچایا ہے۔احمد بشیر برزی شعور پاکستانی کی طرح پاکستان میں فوج کے خود تفویض کردہ حق حکمرانی کے شدید مخالف تھے۔اکثر احباب ترقی پسند تنظیم اور کمیونسٹ پارٹی کے طرز عمل اور منافقت پر تنقید کے

جواب میں انہیں مسلم لیگی ہونے کا طعنہ بھی دیا کرتے تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ دائیں بازو کے سرمایہ دارانہ، رجعت پسندانہ افکار اور نظریات اور ملائیت کے کٹر دشمن تھے۔ ترقی پسندوں کی اکثریت کے بارے میں حبیب جالب نے کہا تھا کہ یہ لوگ ''اپنی'' ترقی پسند ہیں۔ مگر احمد بشیر پاکستان کے ان معدودے چند ترقی پسندوں میں شامل تھے جو اپنی ترقی کے بجائے انسانیت کی ترقی پسند کرتے تھے اور اسی مقصد کے لیے انھوں نے اپنی راہوں کا تعین کیا اور زندگی بھر اس پر تر و تازہ اور توانا چلتے رہے۔ انھوں نے کوئی ادبی اور سیاسی انجمن ستائش باہمی نہیں بنائی۔ حکومتی حلقوں اور میڈیا میں انھوں نے اپنا رسوخ نہیں بڑھایا۔ بلکہ جب بھی انہیں کوئی ایسا موقع ملا انھوں نے اسے اپنا وقار گنوانے کے لیے اپنی بھر پور توانائیاں استعمال کیں۔ حالانکہ یہی احمد بشیر اپنے عہد کے بڑے عہدیداروں کا دوست، ہمنشین اور ہمعصر تھا۔ جن میں ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، ابن انشا، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، صفدر میر، حنیف رامے جیسے عہد ساز لوگوں کے نام آتے ہیں۔ ان میں سے کون تھا کہ جو ان کے کہنے پر ان کے لیے کوشش نہ کرتا اور جس کی کوشش مقبول نہ ہوتی۔ مگر یہ ان کا مزاج ہی نہ تھا۔ وہ تو زندگی کی ایک ترنگ میں حال مست تھے۔ ہر چند انہیں بھی اپنے چاہے اور سراہے جانے کا شوق تھا۔ وہ اپنے لیے ہر وہ چیز پسند بھی کرتے تھے جس کی ایک دنیادار تمنا کرتا ہے۔ مگر ان کی یہ تمنا اتنی شدید نہ تھی کہ جس پر وہ اپنی انا اور اصولوں کو قربان کر دیتے۔ وہ جاہ و منصب اور مقام و مرتبے کے بھی خواہش مند تھے مگر وہ مقام جس کے لیے وہ اپنے آپ کو اہل اور قابل سمجھتے تھے۔ اہلیت اور قابلیت کے باوجود ان کو نظر انداز کیے جانے کا ملال کہیں کہیں ان کی تحریر میں بھی آ گیا ہے۔ مگر وہ اپنی بے جا تعریف اور جاہ و حشمت کے دیوانے نہیں تھے۔ انھوں نے زندگی میں کوئی بھی کام اپنی شہرت کے لیے نہ کیا۔ بس سر میں جس کام کا سودا سما جاتا اس پر ہمہ وقت و ہمہ تن جت جاتے بطور ایک اہل قلم اور صحافی وہ سچ لکھتے ہوئے نتائج کی پروا نہیں کرتے تھے۔ احمد بشیر کی پاکستانی کیمونسٹوں پر تنقید کے جواب میں حمید اختر نے جو مراسلہ جواب آں غزل کے طور پر ''نیا زمانہ'' کو لکھا۔ اس میں ان کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا:

> ''احمد بشیر کا کیمونسٹ پارٹی آف پاکستان سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ پارٹی کے کارکن جب اذیتیں برداشت کر رہے تھے اس وقت وہ سرکاری ملازمت کے مزے لے رہے تھے۔ اس لیے انھیں ایسے دعوے کرنے کا کوئی حق نہیں۔'' (۹)

جس کا جواب احمد بشیر نے نیاز مانہ میں بعنوان ''دامن کو ذرا دیکھ، بند قبا کو دیکھ'' میں جو لکھا اس سے اقتباس دیکھئے:

''پیارا حمید اختر لکھتا ہے کہ پارٹی کے کارکن جب اذیتیں برداشت کر رہے تھے ۔اس وقت میں سرکاری ملازمت کے مزے لوٹ رہا تھا۔ میں ان کو ان مزوں کی حقیقت بتادوں۔ مولانا چراغ حسن حسرت کی سربراہی میں جب سارے سٹاف نے استعفی دیا (اوراس کے پیچھے ایک سازش تھی) تو میں نے بھی دیا۔ کچھ عرصے کے بعد مجھے ریڈیو پاکستان میں سٹاف آرٹسٹ کی نوکری ملی مگر زیڈ اے بخاری سے میری نہ بنی اور ایک دو مہینے بعد مجھے ریڈیو سے نکال دیا گیا۔ پھر میں نے موٹر پارٹس کی ایک دکان میں بطور سیلز مین نوکری کر لی جس کے دوران مجھے گھر کی گاڑی بھی چلانی پڑی۔ وہاں مالک میری توہین بھی کرتا تھا۔ چنانچہ میں ایک مہینے کی تنخواہ چھوڑ کر گھر بیٹھ گیا۔ رہنے کو جگہ نہ تھی۔ اس لیے میں نے لالوکھیت میں جھگی بنائی جہاں مرحوم ابن انشا مجھے ملنے آیا کرتے تھے۔ قریباً ایک سال بعد مجھے پبلک سروس کمیشن کے ذریعے سندھ گورنمنٹ میں انفارمیشن آفیسر کی نوکری ملی۔۔۔۔تو جناب میں نے تو کوئی کاروبار کیا نہ کوئی حرم کی کمائی کی۔ نا جوا کھیلا نہ کسی سوت کی مل سے کپڑے کی ایجنسی لی۔ نا کوئی کوٹے کا انتظار کیا۔ نا بلیک مارکیٹ کی۔ میں نے فقط اپنے دو ہاتھوں کی محنت کو بیچا۔''(۱۰)

یہ خط وکتابت جہاں ان کے آدرشوں کی کٹھنائیوں کا بیان ہے وہاں ناجائز منفعتوں کے حصول کے لیے نام نہاد کامریڈوں کی منافقانہ طرز زندگی کی طرف بھی اشارہ ہے۔ بے نیازی اور دیانت داری کا یہ عالم تھا کہ جب انھوں نے ممتاز مفتی کے ساتھ مل کر مکان الاٹ کروایا تو یہ کہہ کر پورا مکان اس کے نام کر دیا کہ میں مقامی ہوں تم مہاجر ہو اس لیے یہاں سے جانے والوں کی جائداد پر ان کا حق ہے جو اپنی جائدادیں ہندوستان میں چھوڑ کر آئے ہیں۔ ایسی بے نیازی اور ضمیر پرستی اور حق پرستی اس قحط الرجال میں اب کہاں! Dancing with Wolves کے دیباچے میں انھوں نے اپنے بارے میں یہ جو کہا ہے کہ میں نے اپنی پچاس سالہ پیشہ ورانہ زندگی میں اپنے اصولوں پر کسی حکمران سے سمجھوتہ نہیں کیا، بدیں وجہ میری آدھی سے زیادہ زندگی ملازمت سے برطرفی میں کٹ گئی تو یہی دراصل ان کی ساری زندگی کی کہانی ہے۔ جب انسان عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ سوچ

لے کہ 'اسے آج میں زندہ رہنا ہے یا آنے والے کل میں' ۔۔۔واقعہ یہ ہے کہ کل میں تو زندہ رہنے کی خواہش کرنے والے کل کے لیے کمایا ہوا اندوختہ اپنے آج ہی میں کما کر آج ہی خرچ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ کل میں زندہ رہنے کی خواہش کرنے والے اپنے آج میں بھی نامراد رہتے ہیں اور کل میں بھی۔ احمد بشیر ان زیرک اور عرفان یافتہ لوگوں میں تھے۔ جنہوں نے کل میں جینے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے آج کو کل کے زادِ راہ سمیٹنے کے لیے استعمال کیا۔ آگے چل کر کہتے ہیں۔

> I have ben truly dancing with wolves. I have always desired a new, reformed society, a society with a new basis for the distribution of wealth, a society free from exploitation and injustuce. The jouney has not been easy but I have enjoyed it and I will die without regret.(11)

زندگی میں پیش آنے والی مشکلات کا کبھی گلہ نہیں کیا بلکہ بڑے فخر اور اپنی خوبی کے طور پر اپنے اوپر ہونے والی زیادتیوں کا ذکر کیا۔ ان کی زندگی کے جملہ واقعات اور شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس اعتبار سے بہت خوش قسمت تھے کہ ان کے اندر حسد اور بغض نام کو نہیں تھا۔ اگر کوئی جوہر قابل ملتا تو اسے آگے لانے کے لیے ان کی حتی المقدور مدد کرتے۔ ان کے قلم سے بہت سوں کی نام نہاد عزتیں خطرے میں پڑیں اور بہت سوں کے مزاج برہم ہوئے ہونگے۔ مگر انھوں نے اپنی کسی حرکت سے کبھی کسی کا دل نہ دکھایا۔ کسی کو دھوکہ نہ دیا۔ ان کی ترقی پسندی کی جہات بھی دوسرے ترقی پسندوں سے مختلف تھیں۔ اسی لیے ان کے حمید اختر کے ساتھ ترقی پسندی کے حقیقی اور رائج رویے کے بارے میں تحریری مباحث بھی ہوتے رہے۔ اور نجی محفلوں میں بھی ان کی اس معاملے پر بحث چلتی رہی۔ (حمید اختر اور نیلم احمد بشیر وغیرہ سے مصاحبہ، نیز دونوں کے درمیان مراسلہ نگاری کا سلسلہ ''نیاز مانہ'' کے صفحات پر بھی پھیلا) ان کی طبیعت میں سیلانی اور لاابالی پن پایا جاتا۔ بہت جلد باز تھے۔ عدم نے خلوص کے بندوں کی جس ایک خامی کا ذکر کیا ہے وہ خامی ان میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ جہاں دیکھا کہ کوئی کام ان کے ضمیر یا ان کی فکر کے خلاف ہے فوراً اس کا اظہار کر دیتے۔ اگر کسی ملازمت کے تیور کھلے اور پتہ چلا کہ ان کے خیال کے مطابق نہیں تو یہ نہیں سوچا کہ اہل وعیال کے اخراجات کہاں سے پورے ہونگے۔ شاہ دلی اور فراخ دستی کے سبب خودنگہداری اور پس انداز کرنا طبیعت میں شامل ہی نہ تھا اس لیے ان کی زندگی میں روزگار اور معاش کے حوالے سے کوئی استحکام اور تسلسل یا نظم مفقود رہا۔ اس سلسلے میں ان کے اہل خانہ خاص طور پر

ان کی شریک حیات کے صبر و قناعت کی خو بھی لائق تحسین ہے۔ ناجائز ذرائع آمدنی اختیار کرنا ان کا مزاج ہی نہ تھا۔ حکومت وقت کی کوئی بھی پیشکش یا مالی ترغیب ان کے قلم کو خریدنے سے مجبور رہی۔ خود کہا کرتے تھے۔ میرا قبیلہ سچ بولنے والوں کا ہے۔ بقول ممتاز مفتی احمد بشیر ایڈونچریسٹ تھا۔ اس کی ساری زندگی ایڈونچر تھی احمد بشیر وی آئی پی کلچر کے بہت خلاف تھے اور کسی قسم کی خصوصی سہولت یا رعایت لینے کے روادار نہ تھے۔ ایک دفعہ شیخ منظور الٰہی (سابق نگران وزیر اعلیٰ پنجاب) کو احمد بشیر کی بیماری کا علم ہوا تو انھوں نے انہیں علاج کروانے کی پیشکش کی۔ مگر انھوں نے منظور نہ کیا۔ اس کے کئی سال بعد جب مرض الموت میں مبتلا تھے۔ ان کی قناعت اور دیانتداری کا اندازہ ان کے ایک خط سے لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے اکادمی ادبیات کے (اس وقت) چیئرمین افتخار عارف کے نام لکھا۔ عبارت سے لگتا ہے کہ یہ ان کے ہاتھ سے لکھی ہوئی آخری تحریر ہے۔ (۱۲) جس میں انھوں نے افتخار عارف کا دیا ہوا پچیس ہزار کا چیک برائے علاج شکریے کے ساتھ یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ وزیر اعلیٰ نے ان کے علاج معالجے کا انتظام کر دیا ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتیں آئینی طور پر اپنے شہریوں کو علاج معالجہ کی سہولت فراہم کرنے کی پابند ہیں۔ احمد بشیر بھی بطور ادیب اکادمی کے مخصوص فنڈ سے اس امداد کا حق رکھتے تھے مگر اس سطح پر وہ اپنے آپ کو وی آئی پی نہیں سمجھتے تھے کہ جن کے لئے سرکاری ہسپتالوں میں الگ سے گرانٹ مختص کی جاتی ہے جو بیماری کی صورت صرف انھی پر خرچ کی جاتی ہے۔ کسی عام شہری کو اس فنڈ میں سے کوئی سہولت میسر نہیں ہوتی۔ احمد بشیر کے زندگی نامے کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی شخصیت کے کئی پہلو لوگوں کے ساتھ ان کے رویوں اور برتاؤ سے بھی ہویدا ہیں جن کا تذکرہ ذیلی عنوان کے تحت کیا جا رہا ہے۔

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا

حمید اختر

۔۔۔ میں انیس سو چھیالیس میں ساحر لدھیانوی کے ساتھ مل کر بمبئی گیا۔ اس کا ایک کلاس فیلو بلونت رائے جس کا تعلق کانگرس سے تھا۔ اور ان دنوں بمبئی میں کاروبار کرتا تھا۔ اس نے ایک فلم ''آزادی کی راہ پر'' بنانے کا پروگرام بنایا۔ جس کے لیے ساحر مجھے ساتھ بمبئی لے گیا۔ ایک دن میں کرشن چندر کے ہاں ممتاز مفتی سے ملنے کے لیے گیا۔ تو وہاں پر ایک نوجوان کو لہک لہک کر بولتے

دیکھا۔ پتہ چلا یہ احمد بشیر ہے اور یہ لاہور سے مفتی صاحب کے ساتھ ایک فلمی رسالہ نکالنے کے لیے بمبئی آیا ہے۔ یہ میری احمد بشیر سے پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد لاہور میں ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ چلا۔ دراصل پروین اور میری بیوی دونوں مدرسہ البنات کلاس فیلو تھیں۔ احمد بشیر کے ساتھ قربت اور گھریلو تعلقات کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ بہر حال احمد بشیر کے ساتھ لاکھ اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر ایک بات طے ہے کہ اس نے زندگی بھر نقصان اٹھایا مگر جو جی میں ٹھان لیا اس سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹے۔''احمد بشیر اپنے قلم کا دھنی ہونے کے علاوہ وہ زبان اور محفل آرائی کا بھی بادشاہ تھا۔کوئی آدمی ان کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا کہا جاتا ہے کہ اگر اس کو جم کے کام کرنے کا موقع ملتا تو وہ ادب کو اور صحافت کو بہت کچھ دے سکتا تھا۔''(۱۳)

ڈاکٹر صغریٰ صدف

میں نے ملاقات سے پہلے انہیں ان کی تحریروں میں دیکھا تھا مگر ان سے میری پہلی ملاقات لاہور میں منعقد ہونے والی عالمی پنجابی کانفرنس ہوئی۔ وہ بہت پیار سے ملے اور بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس دن کے بعد بھی بہت سی ملاقاتیں ہوئی۔ ان کی بیٹی نیلم احمد بشیر میری سہیلی بھی اسی وجہ سے بنی کہ وہ احمد بشیر جیسے بڑے آدمی کی بیٹی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ نیلم میں بھی اپنے ابا کا پرتو ہے۔(۱۴)

سید سبط الحسن ضیغم

''احمد بشیر کا وہ مضمون جو انھوں نے ظہیر کاشمیری کے بارے میں لکھا تھا۔ میرا ان سے پہلا بالواسطہ تعارف تھا۔۱۹۷۲ء میں جب میں گوجرانوالہ سے لاہور منتقل ہوگیا تو ایک دن ان سے ملنے کے لیے مساوات کے دفتر گیا۔ انھوں نے مجھے بھی روزنامہ مساوات میں لکھنے کی دعوت دی۔ میں نے کہا۔''میں بغیر اعزازیے کے نہیں لکھتا۔'' لکھنا بھی نہیں چاہئے۔'' انھوں نے ترکی بہ ترکی

جواب دیا اور واضح کیا کہ مساوات کے حالات اتنے اچھے نہیں اس لیے ہم زیادہ پیسے نہیں دے سکتے۔۔ چنانچہ میں نے مساوات میں لکھنا شروع کر دیا۔ لاہور نقل مکانی کے بعد میں ان کے کہنے پر ان کے ہمسائے میں کرائے کے مکان میں منتقل ہو گیا۔ یہاں ہماری آپس میں خوب نبھی۔ ہمارے درمیان گھریلو تعلقات ان کے کرشن نگر سے چلے جانے کے بعد بھی قائم رہے۔ ایک دفعہ عید سر پر تھی۔ مساوات کے مخدوش مالی حالات کے باعث انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ فری لانسرز کو عید کے بعد ادائیگی کی جائے گی۔ انھوں نے میری پریشانی میرے چہرے سے بھانپ لی۔ جب انہیں تنخواہ ملی تو مجھے اپنی تنخواہ میں سے پانچ سو روپے دے کر کہا عید پر دونوں کا کام چل جائے گا۔ (۱۵)

شعیب عادل

سچ کیا ہے؟ حالات کا سائنسی تجزیہ کیسے کیا جاتا ہے؟ بالا دست طبقے خبروں کو کس طرح توڑ موڑ کر شائع کرتے ہیں اور اس کے پیچھے اصل حقیقت کیا ہے؟ وہ تفصیل سے ہمیں سمجھاتے۔ جب بھی لکھو اس میں، ''میں'' نہیں ہونی چاہیے اور اپنی ذات کی نفی کر کے حالات کا تجزیہ کرنا چاہیے اور سختی سے ہدایت کی کہ خبردار اپنی تصویر میگزین میں شامل نہیں کرنی۔ (۱۶)

مس فرح سعید

میری ایک سہیلی جو سید سرفراز شاہ کی بیٹی ہے اس نے مجھے بتایا کہ احمد بشیر نامی ایک صاحب جو ہاتھ دیکھنے میں تاک ہیں۔ اس کے ابو کے پاس آئے تھے میں شروع ہی سے پامسٹری اور اسٹرالوجی سے دلچسپی رکھتی تھی۔ ایک دن فون کر کے ان کے ہاں چلی گئی۔ بڑے پیار اور شفقت سے ملے۔ علم جفر کے بارے میں میرا تمام تر علم انہی سے اکتساب ہے۔ ان سے محبتوں کا یہ سلسلہ ان کی زندگی کے آخری سانسوں تک جاری رہا۔ علم کی تقسیم کے سلسلے میں بڑے فراخ دل اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ (۱۷)

یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب مجھے نوائے وقت (ندائے ملت) سے محض اس لیے نکال دیا گیا کہ میں کمیونسٹ ہوں۔ اسی دوران فیصل آباد کی ایک ڈرامہ پارٹی کے کہنے پر میں نے ڈرامہ لکھا ''سحر ہونے تک'' ریگل سینما کے احاطے میں نکڑ پر پیپلز ہال (اوپن ائیر) میں ڈرامہ سٹیج کیا۔ اس ڈرامے کو دیکھنے کے لیے ہم نے ریلوے لیبر یونین کے۔۔ علاوہ صحافیوں کو بھی دعوت دی۔ جن میں احمد بشیر بھی تھے۔ وہ ان دنوں روز نامہ امروز میں 'شہر سرائے' کے عنوان سے مستقل کالم لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے اس ڈرامہ پر بھر پور فیچر لکھا جس کی سرخی یہ تھی ۔۔ بھوکے فنکاروں کی ٹولی جو بھوکے رہ کر گلی گلی اور محلوں محلوں ڈرامے کرتی ہے۔ جب یہ لوگوں نے پڑھا تو کئی اہل ثروت لوگ ہمارے پاس آئے۔ جن میں سے ایک جالندھر سویٹ مارٹ (بیڈن روڈ) کے مالک نے ہمارے یونٹ کے لیے کھانے کا انتظام کر دیا۔ صفدر میر ان دنوں پاکستان ٹائمز میں لکھتے تھے۔ انھوں نے اس ڈرامے پر پاکستان ٹائمز میں ریویو لکھا۔ پیپلز پارٹی کے ملک معراج خالد، کوثر نیازی۔ اور لیبر یونین کے سردار ابراہیم بھی ہمارا ڈرامہ دیکھنے آئے۔ انھوں نے ڈرامے کی ٹکٹیں وغیرہ بیچنے کی پیشکش کی۔ یہ سب کچھ احمد بشیر صاحب کی وجہ سے ہوا تھا۔ انھوں نے مجھے روز نامہ امروز میں لکھنے کی دعوت دی اور میں نے امروز میں لکھنا شروع کر دیا۔ وہ بڑے ہمدرد اور لوگوں کی مشکلات دور کرنے کی تگ و دو کرنے والے انسان تھے۔ جن دنوں میں بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر فلم ''دکھ سجناں دے'' کی شوٹنگ کر رہا تھا۔ احمد بشیر نے آدمی بھیج کر مجھے بلایا اور پوچھا '' پتری کیا کر رہے ہو''۔ میں نے کہا فلم بنا رہا ہوں۔ انھوں نے کہا فلم بنانا ہمارے بس کا روگ نہیں۔ چلو یہاں بیٹھ کر کام کرو اخبار میں۔ کل ذوالفقار علی بھٹو نے اس اخبار'' روز نامہ'' مساوات'' کا افتتاح کرنا ہے۔ میں دس سال تک اسی اخبار میں کام کرتا رہا۔ میں سب ایڈیٹر ہونے کے ساتھ ساتھ آرٹیکل بھی لکھا کرتا۔ ان کا یہ مشفقانہ رویہ صرف میرے ساتھ ہی نہیں تھا بلکہ وہ ہر لائق آدمی کو اس کی اصل جگہ پر اکاموڈیٹ کرنے کے خوگر تھے۔ (۱۸)

ڈاکٹر یونس جاوید

مارشل لاء کا زمانہ تھا۔ ستمبر ۸۱ ء میں میرا طویل دورانیے کا ڈرامہ ''کانچ کا پل'' آن ائیر گیا۔ اس نے ٹی ہاؤس میں آتے ہی میرا ماتھا چوما۔ ''تم نے بہترین کھیل لکھا۔ اس کے بعد اس نے اس انگریزی کالمسٹ کو بے نقط سنائیں جس نے اپنے کالم میں ڈرامے کی تعریف تو کی تھی مگر رائٹر کے طور پر میرا نام نہیں لکھا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ احمد بشیر خود اس کالمسٹ کے پاس گیا اور اسے جو کچھ انھوں نے کہا۔ مجھے وہ سب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔''(۱۹)

اظہر جاوید

''جب ضیاء الحق کی آمریت نے جمہوریت کی بحالی کی تحریک سے وابستگی اور اس کے لیے بیانات دینے پر نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات پاکستان ٹائمز ،امروز ،اور مشرق سے دس صحافیوں کو نوکریوں سے برخاست کیا تو ان میں دسواں سوار میں تھا۔ اسی زمانے میں جب بے نظیر بھٹو جلا وطنی سے واپسی پر روزنامہ ''مساوات'' دوبارہ شائع ہونے لگا۔ ظہیر بابر کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ مسعود اشعر اور منو بھائی بھی اس سے وابستہ ہو گئے۔ یہ احمد بشیر ہی تھے جنھوں نے پورے زور اور اصرار سے ظہیر بابر کو کہا اظہر جاوید کو بھی ملازمت دو۔ مسعود اشعر حالانکہ امروز میں میرے سینئر تھے اور انہیں پتا تھا میں ''امروز'' کا ادبی صفحہ اور ہفتہ وار میگزین ترتیب دیتا تھا۔ مگر انھوں نے نہ ہی میری سفارش کی اور نہ ہی احمد بشیر کی تجویز کی حمایت کی۔ مجھے بہر حال ''مساوات'' میں نوکری مل گئی اور جب بے نظیر بھٹو کی حکومت آنے پر تمام برخاست شدہ صحافیوں کو امروز میں بحال کر دیا گیا تو میں بھی ''امروز'' میں واپس چلا گیا اور کمال کی بات یہ ہے احمد بشیر اس بات کو بھول ہی گئے۔ انھوں نے کبھی احسان نہ جتلایا۔''(۲۰)

عکسی مفتی

''احمد بشیر میرے والد (ممتاز مفتی) سے چھوٹے اور مجھ سے بڑے تھے۔ چنانچہ میری لڑکپن میں ان سے بہت دوستی تھی۔ کراچی میں قیام کے دنوں کی بات ہے۔ میں اس وقت میٹرک میں تھا۔ سکول میں پڑھائی نہ ہونے کی وجہ سے میں بہت بور ہوتا تھا۔ ایک دن میں نے احمد بشیر سے اپنی اس بوریت اا بیزاری کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے مجھے پینٹنگ کرنے کے لئے بے شمار رنگ، برش اور کینوس لا کر دیے۔ لو پینٹنگ کیا کرو۔'' چنانچہ میں نے اس رنگ و روغن سے بہت سی تصاویر بنائیں۔ میری مصوری کے شوق میں احمد بشیر کی یہ مہربانی شامل تھی اس ایک واقعے سے انداز ہ لگا لیں کہ احمد بشیر کی شخصیت کیسی تھی۔ وہ دوسروں کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔ میں نے احمد بشیر کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزارا وہ ایک سچا کھرا، محبت کرنے والا انسان تھا۔ (۲۱)

صبیحہ حسن

''میری احمد بشیر سے دوستی ۱۹۵۳ء سے ہے۔ جب میں نے سندھ انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر کے طور پر جوائن کیا۔ احمد بشیر بھی انفارمیشن آفیسر ہو کر آئے تھے۔ میں ڈیپارٹمنٹ میں اکیلی لڑکی تھی (اس زمانے میں اکثر جگہوں پر میں اکیلی لڑکی ہی ہوا کرتی تھی)۔ کبھی کبھار کوئی ساتھی میرے کمرے میں کام کے بہانے آ جاتا۔ احمد بشیر سب سے پہلے آ دھمکے۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد زمین پر گھٹنے ٹیک کر ہاتھ لہرا کر مجھ سے اظہار عشق بھی کیا۔ جس پر میں بہت ہنسی اور انھیں یاد دلایا کہ ان کی ایک بہت خوبصورت اچھی سی بیوی ہے۔ جس پر وہ فوراً سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور اقرار کر لیا کہ یہ ڈراما تو صرف روا یتاً تھا۔ اس کے بعد میری ان کی دوستی پکی ہو گئی، اکثر پراجیکٹ جوان کے ذمے ہوتا اس میں مجھے بھی ساتھ لے لیتے۔'' (۲۲)

ڈاکٹر ریاض احمد ریاض نے اپنے مقالے میں بڑی عرق ریزی کر کے احمد بشیر کی تحریروں اور رابطوں کے مطالعے اور تجزیے کے بعد ان کے بارے میں بڑے پتے کی باتیں کی ہیں۔ احمد بشیر کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ''احمد بشیر کو حالات کی گردش کے حوالے سے دیکھیں تو معروف ترقی پسند پریم چند کے ''افسانے ادیب کی عزت کے'' مرکزی کرداروں حضرت قمر اور ان کی بیوی سکینہ کی بہت سی باتیں احمد بشیر اور مودی والی لگتی ہیں یا احمد بشیر اور مودی کے انداز زندگی کی جھلک اس افسانے کے کرداروں میں دکھائی دیتی ہے۔ خود احمد بشیر جیسے سائنٹیفک سوشلسٹ، مارکسی شعور کے پیروکار اور انسانی حقوق کے علم بردار قدرتی طور پر یورپ کے انقلابیوں سے متاثر تھے اور عجیب اتفاق ہے کہ احمد بشیر کی زندگی حالات خیالات افکار اور سوچ کے زاویے یورپ کے انقلابیوں اور دانشوروں سے بہت زیادہ مماثلت رکھتے ہیں مثلا نام بدل بدل کر لکھنے والوں میں یورپ کے برونیں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے وہ بھی سچا انقلابی تھا اور اس کے پاس بھی احمد بشیر کی طرح رہنے کو مکان تک نہ تھا۔ وہ بھی اپنے زمانے کے مولویوں یا مذہبی وڈیروں کے خلاف لکھتا تھا اسے بھی واجب القتل قرار دیا گیا تھا اور یہ سب اعزازات احمد بشیر کو حاصل ہیں بس برونس کی طرح انہیں زندہ نہیں جلایا گیا۔ یورپی دانشوروں سے مماثلت کی دوسری مثال یہ ہے کہ احمد بشیر نے جب اپنی فلم ''نیلا پربت'' بنائی تو اپنے فلمی ادارے کا نام ''فلم یوٹوپیا'' رکھا اور یہ تھامس مور کی مشہور کتاب کا نام ہے اور تھامس مور بھی دنیا اور زندگی کو اپنی جداگانہ نظر سے دیکھنے والا تیاگی تھا اور وہ دنیاوی بادشاہت کو روحانی بادشاہت نہیں مانتا تھا اور اسی پاداش میں اسے قتل کر دیا گیا۔ مگر احمد بشیر والٹئیر کی طرح خوش نصیب رہے کہ نہ انہیں قتل کیا گیا اور نہ جلایا گیا۔ والٹیئر اور احمد بشیر دونوں متعلقات دین کے خلاف تھے اور روحانی مدد کے بجائے مادی مدد کے قائل تھے ان کے انگریزی مضامین کی کتاب "Danceing With Wolves" (بھیڑیوں کے ساتھ رقص) بھی ایک انگریزی فلم کا نام ہے۔'' (۲۴)

حوالہ جات وتوضیحات

۱۔سوانحی مضمون" میں اور احمد بشیر "مشمولہ: دو تحریریں :۱۱

۲۔ایضاً ص:۱۸ ، نیز اس واقعے کا ذکر خود صبیحہ حسن (والدہ شیری رحمٰن) نے اپنے مضمون مشمولہ نیاز مانہ فروری ۲۰۰۵، میں بھی کیا ہے۔

۳۔پروین عاطف سے مصاحبہ حمید اختر (مرحوم) سے مصاحبہ (روزنامہ جنگ ادبی ایڈیشن۔۷جنوری ۲۰۰۵)

۴۔بشریٰ انصاری سے گفتگو

۵۔خطوں میں خوشبو۔۔نامہ بنام ہمایوں: ص۔۹۲

۶۔نیلم احمد بشیر۔۔بابل مورا

۷۔ایضاً

۸۔سنبل شاہد سے گفتگو

۹۔مراسلہ حمید اختر مطبوعہ نیا زمانہ مشمولہ" خون جگر ہونے تک" ص:۲۸۷

۱۰۔مضمون" دامن کو ذرا دیکھ۔۔۔۔مطبوعہ نیا زمانہ شمارہ جنوری ۲۰۰۴ مشمولہ" خون جگر ہونے تک" ص: ۳۶۹

۱۱۔ڈانسنگ وڈ وولف

۱۲۔خطوں میں خوشبو،ص:۱۶۲

۱۳۔ حمید اختر سے مصاحبہ

۱۴۔ڈاکٹر صغریٰ صدف سے گفتگو

۱۵۔سید سبط الحسن ضیغم سے مصاحبہ

۱۶۔نیا زمانہ فروری ۲۰۰۵

۱۷۔فرخ سعید سے مصاحبہ

۱۸۔زاہد عکاسی سے مصاحبہ

۱۹۔ڈاکٹر یونس جاوید سے مصاحبہ

۲۰۔اظہر جاوید: مضمون" باہر سے پتھر اندر سے موم" مشمولہ نیا زمانہ۔فروری ۲۰۰۵ ص:۴۷

۲۱۔نگہی مفتی سے گفتگو

۲۲۔مضمون صبیحہ حسن، مشمولہ نیا زمانہ ،فروری ۲۰۰۵ء،ص:۴۲

۲۳۔مجید احمد

۲۴۔مقالہ ایم فل ''احمد بشیر حیات اور ادبی خدمات'' از ریاض احمد ریاض

باب۔(۳):

مطبوعہ تصانیف کا جائزہ

تصانیف کا جائزہ

احمد بشیر نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز چراغ حسن حسرت کے ساتھ روز نامہ ''امروز'' سے کیا۔ ان کو اپنے قلم سے کام لینا خوب آتا تھا اسی لیے جب ممتاز مفتی نے انہیں صحافی بننے کا مشورہ دیا تو انھوں نے اس طرح ہامی بھر لی۔ بقول ممتاز مفتی'' جیسے صحافی بننا گلاب جامن کھانے کے مترادف ہے۔'' پھر دنیا نے دیکھا کہ وہ صحافت کی دنیا میں بعض حوالوں سے مجدد اور منفرد قرار پائے۔ جس روز ممتاز مفتی نے انہیں صحافی بننے کا مشورہ دیا، اسی شام وہ پاکستان ٹائمز کے نیوز ایڈیٹر محمود کے پاس پہنچ گئے اور انہیں اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ انہی دنوں میاں افتخار الدین نے مولانا چراغ حسن حسرت کے زیر نگرانی ایک اردو پرچہ ''امروز'' نکالنے کا ڈول ڈالا تھا۔ (روز نامہ امروز کافی دیر تک ترقی پسندوں کا ترجمان رہا۔ اور اس کا صحافت کی دنیا میں خوب نام تھا۔ چراغ حسن حسرت اس روز نامے کے چیف ایڈیٹر تھے)۔ محمود نے مشورہ دیا کہ وہ مولانا سے ملیں چنانچہ احمد بشیر بغیر کسی سفارش اور رسمی اجازت کے ان کے دفتر جا پہنچے۔ چراغ حسن حسرت نے ایک نہایت ہی دلچسپ اور غیر روایتی انٹرویو لیا۔ انٹرویو میں کامیاب ہونے کا قصہ وہ بڑے مزے مزے سے سنایا کرتے تھے۔ بہر حال انہیں روز نامہ ''امروز'' میں سب ایڈیٹر کی ملازمت مل گئی۔ مولانا کے ساتھ گزرے دنوں اور ان کی معیت میں گزری ہوئی راتوں کا تذکرہ انھوں نے چراغ حسن حسرت کے خاکے'' قلندر '' میں بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ اس خاکے میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ چراغ حسن حسرت کے ساتھ شام ڈھلے اس بازار میں جاتے تو اپنے ہوش وحواس اس لیے قابو میں رکھتے کہ مولانا نشے میں پورے مست الست ہوتے۔ ان شب زادیوں کا تو کام ہے کہ اپنے قدر دانوں جنہیں وہ گاہک قرار دیتی ہیں، ان سے پیسے اینٹھنے کا انہیں خاص ڈھنگ آتا ہے۔ مگر احمد بشیر نشے میں جھومتے مولانا کے پیسے بچانے کو ہر دم مستعد رہتے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب مولانا کا ہاتھ اپنی جیب میں جاتا۔ وہ ان کا ہاتھ پکڑ لیتے۔(۱)

روز نامہ امروز میں ان کی اور مولانا چراغ حسن حسرت کی گاڑھی چھنتی تھی۔ مولانا کی جوہر شناس نظروں کو احمد بشیر کا بے باک ہونا اور صاف گو اور ہمدرد ہونا بھا گیا تھا۔ چند سال کے بعد جب چراغ حسن حسرت کی میاں افتخار الدین سے ان بن ہوئی تو چراغ حسن حسرت کے ساتھ وہ بھی امروز سے علیحدہ ہو گئے۔ پھر جب چراغ حسن حسرت کو ریڈیو پاکستان کراچی پر ایک قومی پروگرام کے سکرپٹ رائٹر کی پیشکش ہوئی تو انھوں نے تار دے کر احمد بشیر کو کراچی بلا لیا(۲) اور دونوں نے وہاں سکرپٹ رائٹرز کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ مگر مولانا کو ریڈیو پر لکھنے کا تجربہ نہیں تھا۔ اسی طرح احمد بشیر گو اخبار میں فیچر رائٹنگ کے بانی تھے مگر ریڈیو اور اخبار کے فیچر میں فرق ہوتا ہے۔ دراصل ریڈیو ٹیلی ویژن کے لیے لکھنے والے رائٹر کو اپنا انداز اور اسلوب ترک کرنا پڑتا ہے۔ صحافت میں وہ مولانا چراغ حسن حسرت کو اپنا استاد سمجھتے تھے کیونکہ اس میدان میں مولانا نے ان کی بہت راہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔ کراچی سرکاری ملازمت کے بعد جب وہ واپس لاہور آئے تو روز نامہ امروز میں ''شہر سرائے'' کے نام سے کالم لکھنے لگے۔ امروز کیونکہ چراغ حسن حسرت کا پروردہ تھا اور اسے مالی و اخلاقی سرپرستی میاں افتخار الدین کی حاصل تھی یہ سب لوگ پاکستان میں سرمایہ دار و جاگیردار سماج کے خلاف تھے۔ چنانچہ اس اخبار کا بایاں بازو بہت مضبوط تھا۔ احمد بشیر نے اس دور میں اپنی اخباری تحریروں کا محور و موضوع عالمی استعماری نظام اور اپنے نظام کی خرابیوں اور سیاست دانوں کی کج رویوں کو بنایا۔ ساٹھ کی دہائی میں اس اخبار کا مزاج کافی بدل چکا تھا مگر احمد بشیر کا مزاج وہی تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جو اکثر ہوا کرتا تھا۔ احمد بشیر نے امروز چھوڑ دیا۔ انھوں نے ہر دور میں مارشل لاء کی مخالفت کی اور اس کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کی حمایت میں قلم اٹھایا۔ بدقسمتی سے پاکستان کی مذہبی جماعتوں کا موقف امریکہ اور یورپی اقوام کے بارے میں اتنا غیر واضح تھا کہ ان پر ان اقوام کے ہمنوا اور حمایتی ہونے کا گمان ہوتا تھا اور پھر جب یہ جماعتیں اشتراکی فلسفہ معاش اور سوویت یونین کے پیچھے لٹھ لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں تو یہ شک یقین میں تبدیل ہو گیا۔ یہ ایوبی آمریت کا آخری دور تھا۔ ملک کے سیاسی حالات روز بروز بگڑتے جا رہے تھے۔ اور جب ذوالفقار علی بھٹو نے اسٹیبلشمنٹ کی پروردہ اور پٹی ہوئی سیاسی جماعتوں سے ہٹ کر ایک الگ پارٹی کی بنیاد رکھی تو ملک کے بائیں بازو کے ادیبوں اور اہل قلم نے اس کے ترقی پسند منشور کو دیکھتے ہوئے اس کی حمایت کی۔ ملک میں اس وقت تمام تر اخبارات دائیں بازو کے تھے۔ اور چھوٹے چھوٹے رسائل اور روز ناموں کے علاوہ کوئی ایسا باقاعدہ روز نامہ نہیں تھا جو کہ لیفٹ کے خیالات کی ترجمانی کر سکے۔ احمد بشیر نے ''احسان'' اور ''لیل و نہار'' میں بھی کام کیا۔ بلکہ لیل و نہار کے ایڈیٹوریل بورڈ میں

شامل رہے۔(۳) چنانچہ جب محمد حنیف رامے نے بائیں بازو کا اخبار "مساوات" جاری کرنے کا پروگرام بنایا تو اس نے احمد بشیر کو بھی دعوت دی جو انھوں نے قبول کر لی چنانچہ وہ مساوات کے پہلے انچارج ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس دور کے دیگر پروگریسو رائٹرز کی طرح وہ بھی سیاسی طور پر پیپلز پارٹی کے حامی تھے اور یہ روزنامہ پیپلز پارٹی کا ترجمان تھا۔ مگر ان کی کوشش یہ تھی کہ یہ پرچہ پیپلز پارٹی کے منشور کی روشنی میں پارٹی کو گائیڈ لائن دینے کا فریضہ کماحقہٗ ادا کرے۔ وہ مساوات میں ایڈیٹوریل لکھا کرتے تھے۔ اس وقت پاکستان میں دائیں بازو کی جماعتوں میں پیپلز پارٹی کے خلاف سب سے زیادہ سرگرم سیاسی مذہبی پارٹی، جماعت اسلامی تھی۔ جس کے امیر مولانا مودودی اس وقت سیاست میں متحرک تھے۔ ان کی تحریروں نے اس اخبار کا ایک اعتبار عوام میں پیدا کر دیا۔ انھوں نے خود اپنے ایک خط میں اسی بات کا اظہار کیا ہے۔" میں جب تک وہاں رہا ایڈیٹوریل رائٹر رہا اور میرا اداریہ لوگ پڑھتے تھے حالانکہ اداریہ بالعموم پڑھا نہیں جاتا۔ اگر شہادت مطلوب ہے تو میرے ایڈیٹر حنیف رامے سے پوچھ لیجئے۔"(۴)

یہ مارشل لاء کا دور تھا۔ سچ لکھنا اتنا آسان نہیں تھا مگر انھوں نے ساری زندگی جو سچ سمجھا وہ لکھنے سے باز نہیں آئے۔

جب سقوط ڈھاکہ کے بعد پیپلز پارٹی برسر اقتدار آ گئی۔ ان دنوں وہ مساوات کے انچارج ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے اخبار کے اداریوں میں وزیروں کبیروں کی پاکستان میں ماورائے فرائض "حرکات" کو موضوع بنانا شروع کر دیا۔ چیئرمین بھٹو نے فون پر ان کی سرزنش کی۔ مگر ان کے قلم کی جولانی اسی طرح قائم رہی۔ چنانچہ جب انھوں نے اس وقت کے وزرا کی سرگرمیاں اور ان کے چلن کو پارٹی منشور کے خلاف پایا تو اس پر بروقت قلم اٹھایا۔ خاص طور پر پارٹی کے اندر دائیں بازو کا طبقہ ان کی تنقید کا نشانہ بنتا تھا جب کوثر نیازی وزیر اطلاعات بنے تو ان کی روش اور ان کی حرکتیں دیکھ کر انھوں نے ایک کالم لکھا جس کا عنوان تھا" یہ پری چہرہ لوگ ۔۔۔" وہ یہ کالم پڑھ کر بہت تلملائے۔ انھوں نے بھٹو سے ان کی شکایت بھی کی۔ جب حنیف رامے وزیر اعلیٰ پنجاب بنے تو مساوات کے چیف ایڈیٹر خورشید عالم آئے۔ ان کے بعد صفدر میر اور پھر عباس اطہر، شوکت صدیقی اور دیگر، دراصل احمد بشیر کا موقف تھا کہ یہ ایک پارٹی کا اخبار ہے اور اس کا تعلق عوام سے ہے۔ چنانچہ اس اخبار کا فریضہ ہے کہ وہ پارٹی کے افراد کی غلطیوں کی نشاندھی کرے، اچھی باتوں پر ستائش کرے۔۔ چنانچہ وہ اپنے انداز نگارش سے باز نہ آئے۔

۱۹۸۱ء میں کراچی کا مشہور روزنامہ جنگ لاہور سے بھی جاری کیا گیا تو اس نے اپنے اخبار

کی جگہ بنانے اور نوائے وقت کی اجارہ داری ختم کرنے کے لیے بڑے بڑے نامور اخبار نویسوں کی خدمات حاصل کیں۔ کیونکہ پنجاب میں اور خاص طور پر لاہور میں یہ اخبار اپنی حق گوئی اور صحافتی اقدار کی آبیاری کی وجہ سے لاہوریوں کے دل و دماغ پر پوری طرح چھایا ہوا تھا جب کہ جنگ، کراچی کا تاثر حکومتی ترجمان کا تھا۔ اس بات کا ادراک میر خلیل الرحمان کو بھی تھا۔ چنانچہ انھوں نے عوام کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ لاہور کے نامور ادیبوں اور صحافیوں کو جنگ کے صفحات پر اپنا جادو جگانے کی دعوت دی۔ ان نامور ادیبوں میں احمد بشیر بھی تھے۔ وہ اس اخبار میں ایک طویل عرصے تک اداریے اور کالم لکھتے رہے۔ اکثر کہنہ مشق صحافیوں کا کہنا ہے کہ اس پرچے کے مقبول ہونے میں ان کے کالموں اور اداریوں کا بھی حصہ تھا۔ یہ مارشل لاء کا زمانہ تھا۔۔ چنانچہ تابہ کے!۔۔۔ ان کے سخت گیر کالموں کی حکومت وقت تاب نہ لا سکی اور انہیں 'جنگ' سے علیحدہ کر دیا گیا۔ پھر جب ضیائی مارشل لاء کے دور میں ''فرنٹیئر پوسٹ'' نکلا تو اس کے صفحات پر بھی احمد بشیر کا قلم جولانیاں دکھانے لگا۔ یہ پرچا اپنے تند و تیز مضامین کے باعث خاصی شہرت کا حامل رہا۔ ان لکھنے والوں میں احمد بشیر بھی سرفہرست تھے۔ مگر ان کی تحریر خود ہی ان کی پہچان تھی۔۔۔ خون زخم آ ہو واں رہبر شود صیاد را ۔۔ اور ان کا نام بدل بدل کر لکھنا بھی سگ ہائے سرکار کی مشام تیز سے نہ پوشیدہ رہ سکا اور وہ انگریزی اخبارات میں بھی شجر ممنوعہ قرار پائے۔ یہاں یا ؤش بخیر فرنٹیئر پوسٹ (انگریزی اخبار) کا تذکرہ ضروری ہے۔ یہی ایک اخبار تھا جس کا مالک بقول احمد بشیر ضیاء الحق سے جھاڑ جھڑکیاں کھالیتا تھا مگر انہیں نکالتا نہیں تھا۔ حکومت نے اس اخبار کے اشتہارات بھی بند کر دیے۔ مگر یہ اخبار احمد بشیر کو چھاپتا رہا۔ ملاحظہ ہوں احمد بشیر کے الفاظ: ضیاء الحق نے اس فقیر کو اپنے گیارہ سالہ دور میں گیارہ نوکریوں اور اردو اور انگریزی کے چار اخبارات سے نکلوایا۔ پانچویں اخبار فرنیٹر پوسٹ سے وہ نہ نکلوا سکے کیونکہ اس کا مالک رحمت شاہ آفریدی ضیاء الحق سے جھاڑ کھالیتا تھا مگر مجھے نکالتا نہیں تھا اور اگر اس کے اخبار کو اشتہار نہیں ملے اور وہ ناکام ہو گیا تو اس کی ایک وجہ بلھے شاہ بھی تھا۔ جب حکومت کے دباؤ پر یہ پرچہ بند ہو گیا تو وہ ایک بار پھر بے روزگار ہو گئے۔ جب ''نیا زمانہ'' لاہور نے ان کے آرٹیکل من و عن شائع کرنے کی ہامی بھر لی تو انھوں نے کتھارسس کے لیے اس میں لکھنا شروع کر دیا اور آخری دم تک اس پرچے میں لکھتے رہے۔ انھوں نے نیا زمانہ میں زندگی کا آخری کالم ''سن دو ہزار تین میں'' مئی ۲۰۰۴ کے شمارے میں لکھا۔

بطور ایک صحافی، ان کا انداز تحریر ان کا اپنا ہی ایجاد کردہ تھا۔ مگر دبنگ نویسی میں برصغیر کے عظیم، نڈر اور دلیر اخبار نویسوں محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، حمید نظامی اور مولانا صلاح الدین کی یاد

دلاتا ہے۔ان میں سے غالباً محمد علی جوہر کو چھوڑ کر باقی تمام ان کے ہمعصر تھے۔گویا ان کی صحافتی تربیت انہی حضرات کی تحریریں پڑھتے ہوئے ہوئی تھی۔ اور انھوں نے لکھتے وقت انہی مقاصد کو پیش نظر رکھا۔البتہ فنی اعتبار سے ان کی نثر میں طنز کی کاٹ ہمارے معاشرتی شعور سے عدم مطابقت رکھتی تھی۔انھوں نے قلم کا فریضہ اس احسن طریقے سے انجام دیا کہ یہ کالم اور اداریے کی دنیا میں انہی کا حصہ ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ جن حضرات کا ذکر اوپر کیا گیا ان کی حریت فکر کے چراغوں کی لو میں احمد بشیر نے اپنے لیے جرأتِ اظہار کی راہ ڈھونڈی تو غلط نہ ہوگا۔

فیچر نگاری، آج پاکستان میں صحافت کا جزو لاینفک بن چکی ہے۔جرنلزم کے طالبعلموں کے لیے یہ بات ریکارڈ پر رکھنے کے قابل ہے کہ اردو صحافت میں فیچر نگاری کا نقش اول احمد بشیر ہیں۔(۵) انھی نے اردو صحافت میں فیچر نگاری کا آغاز کیا۔انھوں نے اردو کا پہلا فیچر روز نامہ 'امروز' کے لیے مولانا چراغ حسن حسرت کے کہنے پر لکھا۔اور یہ فیچر لاہور کے بازارِ رقص ونغمہ کے بارے میں تھا۔اس کے بعد انھوں نے ایک فیچر شورش کاشمیری کے پرچے ''چٹان'' کے لیے بھی لکھا۔انھوں نے شورش کے ساتھ اس بازار میں جا کر شورش کی کتاب ''اس بازار میں'' کا اصل مسودہ بھی لکھا۔(۶) شاید یہ کتاب حکومت پنجاب نے سنسر کر دی تھی۔اس کے کئی سال بعد جب یہ کتاب منظر عام پر آئی تو بے ترتیب متن اور مصنف کے مبہم مطمعٔ نظر اور غیر واضح پیغام کے باعث کچھ زیادہ مقبولیت نہ حاصل کر سکی۔حالانکہ ''چٹان'' کے شماروں میں اس کی آمد کی تادیر تشہیر کی جاتی رہی۔احمد بشیر کے صحافتی سفر میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ احمد بشیر نے جب صحافت کا آغاز کیا تو اس وقت، روز نامہ ''امروز'' پاؤں پاؤں چلنا سیکھ رہا تھا۔ چراغ حسن حسرت ابھی اس پرچے کے ابتدائی مراحل ترتیب دے رہے تھے۔اس کے بعد مساوات میں چلے گئے تو مساوات بھی اپنے ابتدائی دور سے گزر رہا تھا۔ جہاں انھیں پیپلز پارٹی کو ترقی پسند سیاست کی پہچان دینے کا موقع ملا مگر پی پی کے بعض لیڈر جن کا تعلق پارٹی کے دائیں دھڑے سے تھا وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔بقول ان کے بھٹو بھی ایسا نہیں چاہتے تھے۔ایڈیٹر شوکت صدیقی کا بھی خیال تھا کہ اب ہماری حکومت بن چکی ہے اس لیے آج ہمیں مارکسی یا بائیں بازو کی نظریاتی سیاست کی ضرورت نہیں رہی مگر احمد بشیر اپنا اداریہ انہی خطوط پر لکھتے رہے۔(۷) اسی طرح روز نامہ جنگ لاہور کا بھی احمد بشیر ہی سے آغاز ہوا۔یہ محض حسن اتفاق ہو سکتا ہے مگر جب بھی کوئی اخبار اپنی اشاعت کے سن بلوغت تک پہنچا۔احمد بشیر نے وہاں سے سفر کا نیا موڑ لیا۔انھوں نے زندگی صحافت کی مچانوں اور مسافت کی اڑانوں میں گزار دی۔ان کے انگریزی کالموں کے مجموعے کے آغاز میں

ایک جملہ جو ان کے قلمی منشور کی وضاحت کرتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ جب میں قلم ہاتھ میں لے کر لکھنا شروع کرتا ہوں۔اس وقت میں خود کو محاذِ جنگ پر محسوس کرتا ہوں۔اان کا قاری ان کے اس دعوے کی سچائی کا خود گواہ ہے۔ان کے صحافتی دور میں ایک دور ایسا بھی آیا جب ہر اخبار نے انہیں، چھاپنے سے انکار کر دیا۔کیونکہ وہ جو لکھتے تھے وہ حکومت وقت کے لیے نا قابل برداشت تو تھا ہی مگر اخبار کے مالکان جو اکثر حکومتی اشتہارات پر یا حکومتی اشتہارات کے لیے صحافت کرتے ہیں۔وہ ایک معمولی سے کالم نگار کے لیے اپنی روزی روٹی پر لات نہیں مار سکتے تھے۔جب مارشل لاء کے دور میں انہیں اخبارات نے چھاپنے سے انکار کر دیا اور وہ نام بدل بدل کر لکھتے رہے۔مگر پھر بھی پہچانے گئے۔ایک خیال آتا ہے کہ اگر وہ نوائے وقت کی طرف رجوع کرتے تو شاید انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔مگر نجانے کیوں وہ تمام دائیں بازو کے طبقات سے بہت زیادہ گریزاں رہتے تھے۔وہ آج کے دور کے کالم نگاروں کی طرح حکومت کی نظر میں اپنی قیمت لگوانے کے لیے نہیں لکھتے تھے۔اگر ایسا ہوتا تو کبھی حکومتیں ان سے نالال نہ ہوتیں۔بہر حال اردو دنیا میں یا دنیائے اہل قلم میں جو صحافت ان کی پہچان بنی اس کی داستان بہت طویل اور تکلیف دہ ہے۔

خون جگر ہونے تک (مضامین)

یہ کتاب دراصل احمد بشیر کے ایک ماہنامے میں چھپنے والے مضامین کا مجموعہ ہے۔ فروری انیس سو اڑتالیس میں اان کے جس صحافتی سفر کا آغاز ہوا تھا وہ ان مضامین پر اختتام پذیر ہوا۔آواز اشاعت گھر ،لاہور سے شائع ہونے والی یہ کتاب (س۔ن) ۲۹۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ان کے یہ مضامین پاکستان کی سیاسی تاریخ اور اس کے دامن میں فروغ پانے والے کلچر کے افسوس ناک تذکرے بھی ہیں اور اور بے لاگ تبصرے بھی۔مشمولہ مضامین کی ترتیب یوں ہے:

۱۔ یوم مئی ہمیں کیا سکھاتا ہے
۲۔ قاضی حسین احمد کے اسلامی نظام کا خاکہ
۳۔ کالم نگاروں کی قلابازیاں
۴۔ پختون قوم پرستی کی جھلکیاں
۵۔ خرابیاں نہیں غلطیاں گنواؤ
۶۔ سنگ را بستند، و سگ را کشادند

۲۳۔ برادران یوسف

۲۴۔ سچا کھرا انسان

۲۵۔ ہماری باری بھی آسکتی ہے

۲۶۔ یہ کلچر کا مسئلہ ہے بے وقوف

۲۷۔ نیاز مانہ کا کیا فائدہ

۲۸۔ ہندوستان زندہ باد

۲۹۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات

۳۰۔ ایڈوانی جی کے کتنے لمبے ہاتھ

۳۱۔ گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

۳۲۔ سیر کراچی غم دوش، فکر فردا، کمیونسٹ پارٹی

۳۳۔ شیشہ گرو کچھ تو کرو

۳۴۔ ڈاکٹر اسرار کی خدمت میں

۳۵۔ دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

۳۶۔ پنجاب اور پنجابیت

۳۷۔ ۴ سال اور ۵۶ سال

اور ضمیمہ جات (حمید اختر کا پہلا خط۔ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان اور احمد بشیر، دوسرا خط۔۔۔ سب داغ ہیں اس دل پہ بجز داغ ندامت)

ڈانسنگ ود وولف (Dancing with Wolve)

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ ان کے انگریزی میں لکھے گئے کالموں، اداریوں اور مضامین کا مجموعہ ہے۔ جسے جنگ پبلی کیشنز نے شائع کیا تھا۔ (خون جگر ہونے تک کی طرح یہ کتاب بھی بازار میں دستیاب نہیں)۔ اس کتاب میں وہ کالم ہیں جو انھوں نے نام بدل بدل کر کبھی بلھے شاہ، احمد خاں کھرل اور شاہ عنایت کے نام سے، ڈیلی ڈان، فرائیڈے ٹائمز، فرنٹیئر پوسٹ، نیوز، دی نیشن، دی مسلم اور دیگر اخبارات میں لکھے۔ ان مضامین کا انتخاب ان کے دوست ائیر کموڈور اقبال سید کے تعاون سے جنگ پبلشرز نے ۱۹۹۸ء میں شائع کیا۔ (ACKNOWLEDGMENT) کے عنوان سے انھوں نے اپنے دوست ائیر کموڈور اقبال

سید کے تعاون کا تشکرانہ انداز میں ذکر کیا ہے) فلیپ احمد بشیر کی پیدائش، شخصیت اور صحافتی خدمات پر مسلسل تحریر کی صورت میں ہے عام سائز کے ۲۷۳ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے تمہیدی اور رسمی انگریزی الفاظ کے بعد اگلے صفحے پر احمد بشیر نے اپنی قلم بدست کیفیت کا ذکر یوں کیا ہے۔

"WHEN I TAKE UP THE PEN I

AM AT WAR."

(جب میں قلم اٹھاتا ہوں تو حالت جنگ میں ہوتا ہوں)

جیسے رقاص پینترے اور جسم کے زاویے بدلتا ہے۔ اسی طرح اس دورانئے میں انھوں نے جگہیں اور نام بدل بدل کر اپنی کشت سخن کی آبیاری کی۔ اس دورانیہ کو انھوں نے بھیڑیوں کے ساتھ رقص کرنے کے مصداق قرار دیا ہے۔ FOREWORD میں انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ بھیڑیوں سے خوفزدہ ہونے کی بجائے۔۔۔ میں واقعی بھیڑیوں کے ساتھ رقص کرتا رہا ہوں۔ "I Have been truly dancing with wolves" ۔۔۔ مضامین و ابواب کی ترتیب اس طرح ہے:

دیباچہ (FOREWORD) کتاب ''جو ملے تھے راستے میں''

کتاب کے دیباچے میں انھوں نے تقریباً انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جن کا وہ پہلے اپنے کئی مضامین اور خطوط کے علاوہ ''جو ملے تھے راستے میں'' کے دیباچے میں کر چکے ہیں جس میں انھوں نے اپنی صحافتی زندگی میں پیش آنے والی مشکلات، اپنی ثابت قدمی اور حکومتی اور سیاسی کج رویوں کا تذکرہ کیا ہے۔ چند لائنیں ملاحظہ کریں: FOREWORD کے عنوان سے احمد بشیر اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"In this helpless country I have lived the life" of a free citizen. I have never surrounded before any government or compromised on principles...Half of my life, I have been unemployed, resources, (resourcesless) and hungry. I do not know how many jobs I have lost.My most difficult period was the military dictator Zia's II year regime. It was also my most glorious period ....I am not such

a great writer, but I was perhaps, the only one who consistently wrote against the dictator, art lessly too. I have always desired a new reformed society with a new basis for distribution of wealth, a society free from exploration and injustice.

راگ دیس اور پیشہ ورانہ صحافت
RAG DES AND PROFESSIONAL JOURNALISM

اس مضمون میں انھوں نے اپنی مولانا چراغ حسن حسرت کے ساتھ صحبتوں کا ذکر کیا ہے۔اسی واقعے کا ذکر انھوں نے "انٹرویو" میں بھی کیا ہے۔اس سے ان کی موسیقی کے ساتھ وابستگی اور دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔

چچ برہمن کی سلطنت
Kingdom of Chach Brahman

پاکستان میں تاریخ کا معروف version وہ ہے جو ہمارے تعلیمی اداروں میں حکومت کی منظوری سے پڑھایا جاتا ہے۔ہمارے اکثر دانشوروں اور ماہرین تاریخ کے تجزیے تاریخ کے اسی version کی بنیاد پر مبنی ہوتے ہیں۔احمد بشیر کی تحریروں میں جہاں کہیں بھی تاریخ کا حوالہ آتا ہے یہ واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مطالعۂ تاریخ حکومت وقت سے منظور شدہ تاریخ کے بجائے غیر روایتی اور تجزیاتی تاریخ سے ہے اس مضمون سے بھی یہی تأثر ہویدا ہے--- محمد بن قاسم نے راجہ داہر کا سر حجاج کو بھیجا اور اس کی بیوہ سے شادی کر لی۔یوں الور فتح ہو گیا مگر اس کی بیوی کی بہن نے فتح اور عام معافی ٹھکرا کر روڑ کے قلعے میں پناہ لے کر خود سوزی کر لی۔نصابی تاریخ کے طالبعلم کو یقیناً یہ نہیں پڑھایا گیا۔

وارث شاہ ٹلہ جوگیاں میں
WARAS SHAH AT TILA JOGIAN

پنجابی کے مشہور دانشور داستان گو وارث شاہ کہ جن کی لکھی ہوئی۔ہیر وارث شاہ۔۔پنجابی ادب میں لافانی حیثیت کی حامل لوک داستان ہے۔ان کے حوالے سے اس مضمون میں احمد بشیر نے ہمارے معاشرے کے انسانی نفسیات کے خدوخال واضح کئے ہیں اور انسانی حقوق کے بارے میں بڑے صاف صاف انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔

انقلاب فرانس THE FRENCH REVOLUTION

گیارہ صفحوں پر مشتمل یہ مضمون انقلاب فرانس کے حوالے سے ہے۔ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر کام اپنے سلیقے سے ہو۔ جو لوگ کام کرتے ہیں ان سے غلطیاں ہو بھی سرزد ہوتی ہیں۔ (ترجمہ) آزادی، مساوات اور بھائی چارہ فرانسیسی انقلاب کے مقاصد تھے جو پورے نہ ہو سکے ان سے متاثر ہو کر بعد میں فرانس کے مزدوروں نے بغاوت کر دی اور ایک محنت کش طبقہ کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی جس کے لیے فرانس کے حالات ابھی پختہ نہ تھے۔ پیرس کی انقلابی مجلس ناکام ہو گئی کیونکہ اس نے پرانے ادارے ختم نہیں کیے تھے سرمایہ دارانہ نظام بھی خاطر خواہ نہ چل سکا۔

گاندھی کے مظاہر THE PHENOMENON OF GANDHI

اس مضمون میں انھوں نے ڈاکٹر مبارک علی کے تاریخی نظریے پر اظہار خیال کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ کانگریس کی سیاست کو کاروباری طبقہ کنٹرول کرتا تھا اور اپنے طبقے کے مفادات کی حفاظت چاہتا تھا لیکن ڈاکٹر مبارک نے یہ نہیں لکھا کہ کاروباری طبقہ نہ صرف تمام کا تمام ہندو تھا بلکہ ان کا مقصد ہندوؤں کی مذہبی حیثیت کا تحفظ بھی تھا۔

مسلم لیگ کا منشور ۱۹۴۵ء MANIFESTO OF MUSLIMLEAGE 1945

اس مضمون میں انھوں نے پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ کے رہنماؤں کے کردار پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سارا جاگیردار طبقہ تھا چنانچہ مسلم لیگ کے منشور میں پاکستان میں اسلامی قانون کی شمولیت کا شوشہ چھوڑا گیا۔ اور قرارداد مقاصد کو آئین کی راہنما دستاویز بنانے کے پیچھے اسلام کے ذریعے اپنے حق ملکیت کو برقرار رکھنا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے پاکستان کے نظریہ کو مشرف با اسلام کیا گیا۔

قائداعظم کا پاکستان QUAID E AZAM 'S PAKISTAN

احمد بشیر جب پاکستان کی تاریخ پر قلم اٹھاتے ہیں تو نئے نئے حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ انہیں دیگر دانشوروں کی طرح اس بات کا بہت قلق ہے کہ ہمارے اداروں میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے وہ مسلم لیگ کے اکابرین اور بیوروکریسی کی منظور شدہ اور فریم شدہ ہے۔ جس سے تاریخ کے مطالعے کے ثمرات سے قاری محروم رہتا ہے۔ چنانچہ اس مضمون میں بھی ان کے ایسے ہی انکشافات اور اکتشافات پائے جاتے ہیں۔ جن سے کہ قاری، بانی پاکستان کے پیش نظر پاکستان کے قیام کے مقاصد سے آگاہ ہوتا ہے۔ انداز یہاں بھی ان کا اپنا ہے۔

دو ناقد اوراق بر ہندوستان TWO PAGES THAT DOMNED HINDUSTAN

یہ دو صفحے تقسیم ہندوستان کی اس تحریر پر مشتمل ہیں جنہیں ریڈ کلف (Redcliff) نے مونٹ بیٹن کے ایما پر تقسیم کے طے شدہ حصوں میں بد دیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کئی پاکستانی علاقے ہندوستان میں شامل کر دیے اور اس کی فوری وجہ کے متعلق احمد بشیر لکھتے ہیں کہ:

ترجمہ:۔ مونٹ بیٹن ایک متکبر / مغرور آدمی تھا وہ اپنا ذاتی نقطہ نظر رکھتا تھا وہ دونوں ملکوں (پاکستان اور ہندوستان) کا گورنر جنرل بننا چاہتا تھا جب قائد اعظم نے اس کی خواہش مسترد کر دی تو وہ پاکستان کا دشمن بن گیا۔

تقسیم پنجاب کی کہانی STORY OF PUNJAB PARTITION

تقسیم پنجاب پر احمد بشیر کے اس طویل اور بھر پور مضمون میں قیام پاکستان کے وقت اس تقسیم کے سلسلے میں پائی جانے والی سوچ اور اس پر عمل پیرائی کے نتیجے میں دونوں طرف کے افراد کی زندگیوں کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ پنجاب کے دونوں حصوں میں تقسیم کی وجہ سے پائی جانے والی ریاستوں کے والیان کی حکمت عملیاں، چالیں اور تارا سنگھ کے عزائم کا جائزہ لیا گیا ہے۔ لیاقت علی، قائد اعظم اور یونینسٹ پارٹی کے رہنماؤں کے خیالات اور کوششوں کا بڑے غیر جانبدارانہ انداز اور بے لاگ تذکرہ کیا گیا ہے۔

پنجابی کمیونسٹ کا آخری پیار LAST LOVE OF PUJNABI COMMUNIST

ایک پنجابی کمیونسٹ جس کا نام سوہان سنگھ جوش تھا ان کی وفات پر احمد بشیر نے ان کی بے لوث خدمات کو اپنے مضمون میں بیان کیا ہے۔ اس میں سوہان سنگھ جوش کی مستقل مزاجی اور اپنے مقصد سے وابستگی اور عوامی سوچ اور عوامی خدمت کے جذبے کے حوالے سے اس کی زندگی کے واقعات کا بیان ہے اور اس کی موت کو ایک بڑے شخص کی موت قرار دیا ہے۔

مولانا مودودی کی سیاست POLITCS OF MAULAN MAUDODI

اس میں احمد بشیر میاں طفیل محمد سابق امیر جماعت اسلامی کی باتوں کا جواب دیتے ہیں اور یہ بات تاریخی حوالوں سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ امیر جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پاکستان کے قیام کے مخالف تھے۔ اپنی دیگر اردو تحریروں کی طرح یہاں بھی انھوں نے جماعت اور جماعتی سوچ کے خوب لتے لیے ہیں۔

QUAID E AZAM AND NATIONAL LANGUAGES قائداعظم اور قومی زبانیں

قائداعظم کے خیالات اور بیانات کے حوالے سے اردو زبان اور بنگالی زبان اور دیگر زبانوں کو ملک میں رائج کرنے کے حوالے سے یہ بڑا حقیقت افروز مضمون ہے۔ پاکستان کی سرکاری زبان کا قضیہ کوئی عام بات نہیں۔ اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دینے اور پھر اس کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک کرنے کی کہانی بہت پرانی ہے مگر اس کے اثرات پاکستان کے محکوم اور نچلے طبقے کے افراد نے اور مجموعی طور پر پاکستان نے بھگتے۔ انھوں نے قائد کا موقف اور سوچ ان الفاظ میں بیان کر کے ان کی رضا کو عین دانش قرار دیا ہے (ترجمہ)۔ قائداعظم مکمل طور پر صورت حال کو نہ سمجھ سکے وہ انڈیا کے مسلمانوں کے رہنما تھے، اردو زبان مسلم قومیت کی علامت بن چکی تھی۔ اس لیے انھوں نے سوچا کہ اردو زبان کا مرتبہ بنگال کے لوگوں کو بھی سمجھنا چاہیے۔ وہ صوبائی سطح پر پاکستان کی قومی زبان کو دبانا نہیں چاہتے۔ وہ اس بات پر رضامند تھے کہ مادری زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے لیکن بنگالی پریشان تھے۔

STORY OF WEEPING WILLOWS روتے ہوئے بید کی کہانی

احمد بشیر کا لڑکپن اور نوجوانی کے ایام کشمیر میں گزرے۔ چنانچہ کشمیر پر ان کی ہر تحریر میں ان کی کشمیر سے وابستگی اور کشمیریوں کی حالت زار پر کرب پایا جاتا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے بید مجنوں کے درخت کے حوالے سے بھارتی مظالم اور کشمیر پر غاصبانہ قبضے کا ذکر بڑے ادیبانہ انداز میں کیا ہے۔ اس درخت کے پتوں اور پانیوں پر جھکی ہوئی ٹہنیوں اور کشمیریوں کے سرخ رخساروں کا اور جلتے ہوئے دلوں کا شاعرانہ اسلوب میں تذکرہ اس مضمون کا خاصہ ہے۔

DAULTANA ON PAKISTAN دولتانہ پاکستان کے بارے میں

میاں محمد ممتاز دولتانہ کے انکشافات ہیں پر مشتمل اس مضمون میں انھوں نے لیاقت خان علی مرحوم اور پاکستان کے حوالے سے کئے اور قائد کا پاکستان کو لبرل بنانے اور دولتانہ، مولانا شبیر عثمانی اور لیاقت علی خان وغیرہ کا مری میں بیٹھ کر قرارداد مقاصد بنانا اور اس قرارداد کا تنقیدی جائزہ اور دولتانہ کی جاگیرداری کو قائم رکھنے کی کوششوں کا حصول اس مضمون کے اہم انکات ہیں۔ جن کا ان کے اردو مضامین میں متعدد مرتبہ اعادہ کیا گیا ہے۔

گدھے کی گمشدگی اور دریافت LOSING THE DONKEY AND FIND IT

اس انوکھے عنوان کے حامل مضمون میں مغربی سرمایہ دارانہ استعماری طاقتوں کی قابض معاشی پالیسیوں کے حوالے سے بات کی گئی ہے اور ترقی یافتہ ممالک اور ترقی پذیر ممالک کے فرق اور ان کے رویوں پر اظہار خیال کر کے اصلاح احوال کی بات کی گئی ہے۔

فیض اور اس کی دھمال FAIZ AND HIS DHAMAL

اجوکا تھیٹر کو سراہتے ہوئے اس مضمون میں احمد بشیر نے فیض احمد فیض کی شاعری، فکر، جذبہ، حریت، انقلابی رنگ اور محکوم قوموں اور غلاموں کو آزادی کی لوری سنانے کے مختلف مراحل پر اظہار خیال کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اجوکا تھیٹر فیض کی شاعری اور اس میں پنہاں فکر کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کر رہا ہے اور اس کے الفاظ اجوکا کی سیڑھی چڑھ کر دھمال ڈالنے لگتے ہیں اور اس مضمون میں وہ فیض کو شاہکار راہنما اور پیغامبر کے القابات سے یاد کرتے ہیں۔

ماوردی اور قانونِ ضرورت MAWARDI AND THE LAW OF NECESSITY

اس مضمون میں جس موضوع پر بحث کی گئی ہے اس کا تذکرہ ان کے اردو مضمون ۔ایک سچا کھرا مسلمان ۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب پر لکھے گئے مضمون میں بھی کیا ہے۔ اس میں خلیفہ مامون الرشید کے عہد کے عظیم مسلم فلاسفر الماوردی کے حوالے سے قانونِ ضرورت کی وضاحت کی گئی ہے اور اس حوالے سے الماوردی کے خیالات، جذبات اور اسلام کے حوالے سے اس کی ترجیہات اور ان کی کتاب ''احکامِ سلطانیہ'' کا تعارف اور اس کی طباعت اور اس میں پائے جانے والے اہم نکات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ضیاء الحق کے زمانے میں ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کے نظریہ ضرورت کے جائز ہونے پر انھوں نے اس پر تحقیق کر کے ڈاکٹر صاحب کے موقف کی تغلیط کی۔ وہ کہتے ہیں کہ جس کتاب کا حوالہ ڈاکٹر صاحب نے دیا کسی جگہ بھی نظریہ ضرورت کا ذکر نہیں کیا گیا۔

اِدھر ہم اُدھر تم IDHER HUM UDHER TUM

سقوط ڈھاکہ کے باب میں ذوالفقار علی بھٹو کے اس جملے کی بازگشت ہمیشہ سنائی دیتی ہے۔ جبکہ پیپلز پارٹی کے ترجمان اور بہی خواہ اس کی تردید کر چکے ہیں کہ بھٹو نے یہ الفاظ ادا نہیں کئے تھے بلکہ اس مفہوم کو جلی سرخی بنا کر روزنامہ آزاد کے صفحے پر سجانے کی کاوش عباس اطہر نے کی۔ اس مضمون میں انھوں نے اس

مابعد انکشاف POST SCRIT

دو صفحات پر مشتمل اس تحریر میں مختصر الفاظ میں انھوں نے ہنری کسنجر، امریکی کے سابق وزیر خارجہ کے مکتوب کا تذکرہ کیا ہے جس میں اس نے پاکستان کو دولخت کرنے کی امریکی سازش کا ذکر کرتے ہوئے اندرا گاندھی کے امریکی پروگرام کے ساتھ دھوکے کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ یوں سازر یذیڈنٹ اندرا گاندھی لے گئی۔

لمبے کانٹوں کی رات NIGHT OF LONG KNIVES

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی رات کو پاکستان میں جمہوریت کی بساط لپیٹنے کے حوالے سے یہ مضمون کسی نئی بات کا حامل نہیں۔ انھوں نے اس مضمون میں وہی باتیں کی ہیں جو اس دور کے مختلف سیاستدانوں کے حوالے سے منظر عام پر آچکی ہیں۔ خاص طور پر سیاسی جماعتوں کے درمیان سمجھوتے کے باوجود اس ۔۔۔ آپریشن فیئر پلے ۔۔۔ کے ذریعے ملک پر مارشل لاء کا نفاذ ۔۔۔ اس کی سراسر ذمہ داری فوج کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے۔ سیاسی جماعتوں اور سیاسی حکومت کے رویوں اور غلطیوں پر بے لاگ اظہار خیال نہیں کیا گیا۔ جو کہ ان کا خاصہ ہے۔

قانون تقلیل حاصل LAW OF DIMINISHISHIGRETUR

معاشیات کے طالبعلم کے لیے یہ قانون فطرت کی یہ اصطلاح غیر معروف نہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے معاشیات کے حوالے سے ملکی ترقی کی رفتار اور سرکاری محکموں کی کارکردگی کا جائزہ لے کر بہتری کی تجاویز پیش کی ہیں۔ اس مضمون میں ان کی تنقید کی بنیاد ٹھوس معاشی بنیاد پر اعتبار کی حامل ہے۔

ہنس کی پرانی داستان DASTAN GOSE OF YORE

اس مضمون میں شعیب ہاشمی کی طرف سے پیش کردہ کہانی کو انھوں نے مسترد کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ تو پرانے سلسلے کو دھرایا جارہا ہے اور اس میں نیا پن بالکل نہیں ہے اس میں کلچر کی نمائندگی کا نیا رنگ موجود

نہیں اور اس کے علاوہ منشی نولکشور اور اُن کے اشاعتی سلسلے، لکھنو اور اودھ کے کلچر کے بابت لکھا گیا ہے ۔انھوں نے اس امر کی نشاندہی کی ہے یہ کہانی طبع زاد نہیں بلکہ قدیم داستان اور داستانی کلچر کی نمایندگی کرتی ہے۔ جو لکھنو اور اودھ سے مخصوص ہے۔

محبت اور نفرت پر مذاکرہ SYMPOSIUM ON LOVE AND HATE

مذکورہ مضمون میں محبت اور نفرت کے حوالے سے قدیم یونانی تہذیب اور موجودہ حالیاتی، سماجی اور سیاسی تناظر میں اس پر مکالماتی رنگ میں بات کی گئی ہے اور شامل مکالمہ احباب نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ یہاں ان کا تمثیلی انداز دلچسپی کا باعث ہے۔

مہمان آمد برائے خوردن GUEST WHO CAME TO DINNER

یہ محبت اور نفرت کے مکالمے کے مضمون کا اگلہ حصہ ہے اور اس تناظر میں امریکہ، روس اور ملکی سیاسی اور معاشی جمہوری اور غیر جمہوری اور افغانستان کی صورتحال اور اس کے پاکستان پر پڑنے والے ان اثرات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس بڑی طاقتوں کے کھیل میں پاکستان نے کچھ نہیں پایا۔ بس گنوایا ہی گنوایا ہے۔

مضامین اور نفس مضامین FORMS AND CONTENTS

اس مضمون میں مسٹر اے ڈی چوہدری کی برسی کے حوالے سے لاہور ہائیکورٹ بار میں ہونے والی تقریب میں مختلف دانشوروں کے جمہوری بیانات کو لفظوں کا جامہ بنایا گیا ہے اور مارشل لاء لگانے والوں کی اصلیت بیان کی گئی ہے اور اے ڈی چوہدری کو تعریفی انداز میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

کافر بس سٹاپ پر KAFIR ON THE BUS STOP

یہ مضمون احمد بشیر کے ایک قریبی ہمسائے راشد نامی نوجوان کی شادی شدہ زندگی میں مولانا شعیب کے فتویٰ کی وجہ سے خرابی پڑنے اور نکاح کے ٹوٹنے کا ذکر ہے اور راشد کے والدین سے مصنف کی تعلق داری سے ہے اس لیے دونوں میاں بیوی مصنف کو" چاچا جی" کہتے تھے۔ دراصل ایک مولوی کے کہنے پر بقول مصنف غیر اسلامی فتوے کے باعث ان دونوں کا نکاح ٹوٹ گیا۔ اس مضمون میں ان کا لہجہ روایتی طور پر تیکھا اور فکر کا انداز حقیقت پسندانہ ہے۔

مولانااور میڈموں کے بارے میں MAULANAS AND MADAMS

اس مضمون میں علماء کے بھیس میں عیاشی اور فحاشی کے مرتکب لوگوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے اور ظاہرطور پر مہذب خواتین کی اصلیت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ مضمون میں سابقہ حوالہ، کوڈ ورڈ اور سپلائی اور دیگر تمام مراحل کی تفصیل سے بھی اس مضمون کی تحقیقی اہمیت ہمارے سامنے آتی اور اوپر کی دنیا کے کبھی طبقے اور خفیہ محکمے اس کام میں کیا کیا کردار ادا کرتے ہیں ان سب باتوں کی طرف رہنمائی بھی قاری کی معلومات میں حیران کن حد تک اضافہ کرتی ہے۔

شریعت گزیدہ REAPING THE SHARIA WHIRL WIND

شریعت کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال اس مضمون کا حاصل ہے اور اس کی وجہ سے پریشانیوں اور شریعت کے غلط استعمال کی وجہ سے پیدا ہونے والی خرابیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور جس طرح کہ اقبال کا خیال تھا کہ ہمیں شرعی پہلوؤں پر فقہ کے حوالے سے نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ احمد بشیر کا بھی یہی خیال ہے۔ وہ اس کی شدومد سے وضاحت کرتے ہیں اور اپنے متعدد مضامین میں انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے۔

بہت بڑا پولیس مقابلہ THE GREAT POLICE MUQABLA

اس مضمون میں پولیس کے چالیس سال کے دوران ہونے والے مقابلوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس عرصے میں ہونے والی تحریکوں اینٹی خضر موومنٹ، احمدیہ موومنٹ، احرار ایجی ٹیشن، اینٹی ایوب تحریک، آئی جے آئی تحریک، ایم آر ڈی تحریک اور دیگر جلسوں بھاٹی گیٹ اور موچی گیٹ میں ہونے والے عوامی اجتماعات کے دوران پولیس کی کارکردگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور عوامی حقوق کی پامالی میں پولیس کے کردار کا تنقیدی جائزہ اس مضمون کا حاصل ہے۔

محمود بوٹی کا گینگ ریپ THE MEHMOOD BOOTI GANGRAPE

ایک واقعہ جو محمود بوٹی گاؤں میں پیش آیا جب چھے غریب عورتوں کو ان کے بھائیوں، والدین، بہنوں، بچوں اور شوہروں کی موجودگی میں گیارہ افراد جن میں مقامی زمیندار کے بیٹے اور ملازم شامل تھے نے اسلحے کے زور پر ان کی عصمت دری کا سیاہ کارنامہ انجام دیا۔ پچھلے چھے مہینے سے اس کا پرچہ بھی درج نہیں ہونے دیا گیا۔ اس مضمون میں احمد بشیر نے صحافیانہ تحقیق کی تکنیک کو بروئے کار لاتے ہوئے اس

ناانصافی کا باعث بننے والے ان تمام عناصر اور قانون کے پردے میں پائی جانے والی اس لاقانونیت کا پردہ فاش کیا ہے جو قانون کے محافظوں کی سرپرستی میں پھلتی پھولتی ہے۔

ضیاء کو کس نے مارا WHO KILLED ZIA?

اس میں مصنف نے دستیاب شواہد کی بناء پر جنرل ضیاء کے قتل میں ملوث ہونے والے عوامل کا تفصیل سے ذکر کیا اور اور تفتیش میں پائی جانے والی کوتاہیوں اور خامیوں کی نشاندہی کر کے اپنی رائے دی ہے۔

الطاف حسین کے ہیلتھ کلب ALTAF HUSSAIN'S HEALTH CLUB

اس مضمون میں ایم کیو ایم کے رہنما الطاف حسین کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ قتل کے مقدمے میں سزا یافتہ مجرم، ایک مفرور، برطانیہ نے جسے پناہ دینے کے ساتھ ساتھ قومیت بھی دے دی ہے۔ وہ وہاں سے پاکستان کے معاملات میں مداخلت کرتا ہے۔ کوئی آواز نہیں اٹھاتا کہ برطانیہ کا ایک شہری پاکستان میں ، پاکستان کے حالات میں زہر گھول رہا ہے۔

ایک جہادی کی موت DEATH OF CRUSADER

احمد بشیر نے یہ مضمون وارث میر کی وفات پر لکھا۔ وارث میر پر لکھے خاکے میں انہیں ''مجاہد'' کا نام دیا ہے۔ اپنے انگریزی مضمون میں وارث میر کی موت کو ایک مجاہد کی موت کا نام دیا ہے۔ وارث میر کے حوالے سے یہ ایک بنیادی معلومات کا حامل مضمون ہے۔

ایک شہزادہ دفن ہوتا ہے A PRINCE IS BURRIED

روز نامہ امروز کے بند ہونے اور اپنے امروز کے زمانے میں کام کرنے والے ساتھیوں حمید اختر، ظہیر بابر، حامد ہاشمی، شفقت تنویر مرزا، حمید جہلمی، احمد ندیم قاسمی اور چراغ حسن حسرت کے ساتھ بیتے دنوں کا ذکر کیا ہے انھوں نے کہا ہے کہ اپنے وقت کا سب سے بہترین اخبار۔۔امروز شہزادہ دفن کر دیا گیا۔ بڑے جذباتی انداز میں لکھتے ہیں (ترجمہ) جب روز نامہ امروز کے بند ہونے کی خبر ملی تو اس وقت میرے خیالات ہندوستان کی مشہور شہزادی VISH KANYAS (وش کینس) کی طرف گئے جب وہ اپنے محبوبوں / عاشقوں سے ملتی تو اس کے زہریلے اثرات ان میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس کے چاہنے والے آہستہ آہستہ موت سے ہمکنار ہو جاتے۔۔۔ جب میں لکھتا ہوں تو عام طور پر غصے میں ہوتا ہوں مگر آج

میں غصے میں نہیں ہوں بلکہ دکھی ہوں۔۱۰ فروری ۱۹۴۸ء کو مولانا چراغ حسن حسرت نے جو اخبار نکالا تھا وہ کوئی نیا یا دوسرا اخبار نہیں تھا۔ یہ ایک دانشمندانہ جدت کا اظہار تھا۔۔۔۔!

جیوتی باسو کو خط LETTER TO JUYOTI BASU

اس مضمون میں کمیونزم، مارکسزم اور تحریک پاکستان کے زمانے میں کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ احمد بشیر نے متعدد مرتبہ خود کو کمیونسٹ قرار دیتے ہوئے پاکستان اور ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کے طرز عمل پر اظہار خیال کیا ہے۔ یہ خط جیوتی باسو کو لکھا گیا اور آخر میں ان سے خط کا جواب جلدی دینے اور پارٹی کا لٹریچر اور خط و کتابت کے لیے پتوں کی فہرست طلب کی گئی ہے۔ الغرض اس ضمن میں سبھاش چندر بوس، سی آر داس، گھوکلے، مولانا ابوالکلام آزاد، غفار خان اور (C.P.I.) کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا ذکر اور کارکردگی کے حوالے سے سوالیہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ اس مضمون میں بھی ان کا کمیونسٹوں کے بارے میں وہ تأثر نمایاں ہے۔ جس کا ذکر انھوں نے حمید اختر کے نام ایک مراسلے میں بھی کیا۔

میرے سرِ قلم کا فتویٰ FATWA FOR MY BEHEADING

یہ مضمون ان کے ''پھر رہا ہے شہر میں مُلا کھلا'' کی یاد دلاتا ہے۔ جس کا ذکر بڑے مفصل انداز میں آئندہ صفحات میں آئے گا۔ مختصراً یہ کہ احمد بشیر کے خاکوں کی کتاب جب چھپی تو اس میں چراغ حسن حسرت کے خاکے میں انھوں نے جو واقعات بیان کیے تھے ان میں شراب نوشی کا بھی ذکر تھا۔ ۱۹۹۶ء میں علماء نے احمد بشیر کو کافر قرار دیا اور ان کا سر قلم کرنے اور کوڑے مارنے کی ڈگری جاری کی۔ یہ فروری ۱۹۴۸ء میں مولانا چراغ حسن حسرت کے ساتھ شراب پینے اور بلّو بائی کے کوٹھے پر کلاسیکی موسیقی سننے کا اعتراف کرنے پر دیا گیا۔ انھوں نے اس مضمون میں بھی ملائیت اور سطحی سوچ اور اسلام کو ایک کوزے میں بند کر کے رکھنے اور گھن لگے خیالات کی پرزور مذمت کی ہے۔ احمد بشیر ان معدودے چند صحافیوں میں سے تھے جن کی تحریروں سے ان کا مطالعہ، تجزیاتی مطالعہ اور ایک ذاتی نقطۂ نظر ہوا کرتا ہے۔ جو صحافت اخبار کی پالیسی کے مطابق نہیں بلکہ صحافت کے اصولوں کے تحت کرتے ہیں۔ ان کے مضامین میں عالمی تاریخ اور اسلامی تاریخ بلکہ اسلامی ضابطۂ حیات کا گہرا مطالعہ جھلکتا ہے۔ عمرانی علوم (social sciences) کا کوئی بھی شعبہ ان پر بند نہیں تھا۔ ان کی تحریروں میں تاریخی شعور سطر سطر جھلکتا ہے۔ جہاں تک اشترا کی فلسفۂ زندگی کا تعلق ہے اس شعبے میں ان کی معلومات اور تجزیے قابل رشک تھے۔

حواشی وحوالہ جات وتوضیحات

۱۔بحوالہ "قلندر" مشمولہ "جو ملے تھے راستے میں" مرتبہ یونس جاوید

۲۔ بحوالہ پس خود نوشت: دل بھٹکے گا۔ص ۴۵۲

۳۔ہفت روزہ "لیل ونہار" شمارہ اپریل ۱۹۷۰، لاہور

۴۔بحوالہ مراسلہ مطبوعہ نیا زمانہ لاہور شمارہ اکتوبر ۲۰۰۴ء

۵۔حمید اختر کا مضمون مشمولہ نیا زمانہ ۲۰۰۵ء، انٹرویو، احمد بشیر، عوامی جمہوری فورم شمارہ ۱۰، لاہور نیز بحوالہ "قلندر" مشمولہ "جو ملے تھے راستے میں" ص: ۹۰، دل بھٹکے گا، میں بھی انھوں نے اپنی فیچر نگاری کا ذکر بالصراحت کیا ہے ص: ۲۰۳

۶۔بحوالہ مضمون از محمودہ بیگم، مشمولہ، دو تحریریں، نیلم احمد بشیر سے مصاحبہ، مضمون، زاہد عکاسی سے مصاحبہ

۷۔بحوالہ، انٹرویو احمد بشیر، مشمولہ عوامی جمہوری فورم شمارہ ۱۷، لاہور ص: ۱۷

احمد بشیر بطور ادیب

احمد بشیر بطور خاکہ نگار

اردو میں علی گڑھ کی ادبی تحریک کے تحت جب اردو میں سوانح نگاری اور سیرت نگاری میں مولانا حالی نے قلم رکھا۔ ان کی کتاب یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید سے خاکہ نگاری کے خدوخال واضح ہونا شروع ہوئے۔ پھر مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے استاد مولوی نذیر احمد کی کہانی۔۔ کچھ میری [illegible] زبانی لکھ کر اردو میں خاکہ نگاری کی طرح ڈالی۔ اس کے بعد مولوی عبدالحق، چراغ حسن حسرت، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی اور محمد طفیل سے چلتی ہوئی یہ روایت جدید دور تک آئی۔ مذکورہ بالا اہل قلم کے علاوہ حافظ لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، ضمیر جعفری، عطاء الحق قاسمی، نظیر صدیقی اور احمد عقیل روبی کے نام قابل ذکر ہیں۔ بعدازیں خاکہ کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے خاکہ نگاری میں وہ تحریریں بھی شامل ہوتی گئیں جو عام طور پر کسی شخص کی تقریب پذیرائی میں پڑھے گئے اور مشاہیر کی وفات پر لکھے گئے مضامین پر مشتمل تھیں۔ جن میں ممدوح سے اپنی وابستگی اور مشاہدے کے حوالے سے بعض واقعات کا تڑکا بھی لگایا جاتا ہے۔ جس سے ممدوح و مذکور کی شخصیت کے خدوخال بھی واضح ہو جاتے۔ بعض اوقات کسی واقعہ کے بیان میں ممدوح کے ساتھ اپنی قربت اور اعتماد یا بے تکلفی بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔ مگر بعض اوقات قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ خاکہ نگار اپنا تذکرہ اس شد و مد اور تفصیل کے ساتھ کرنے لگا ہے کہ اس کی مرقع نگاری یا خاکہ نگاری خودستائی میں تبدیل ہوگئی ہے اور صاحب۔ خاکہ کی شخصیت پیچھے رہ گئی ہے۔ احمد بشیر کے خاکے میں بھی اول الذکر خصوصیت پائی جاتی ہے۔ مگر ان کی تحریر خودستائی کے الزام سے پاک ہے۔ انھوں نے جس شخصیت پر بھی قلم اٹھایا پہلے اس کا مکمل مشاہدہ کیا۔ اس کے ساتھ ان کی صحبت رہی۔ یہی وجہ ہے کہ قاری خاکہ پڑھ کر محسوس کرتا ہے کہ وہ اس شخصیت سے پہلی بار آشنا ہو رہا ہے۔ انھوں نے کسی ایسی شخصیت کا خاکہ نہیں لکھا۔ جس سے ان کی واجبی شناسائی رہی۔ اور نہ ہی انھوں نے سب ان لوگوں کے خاکے لکھے جو زندگی بھر ان کے ساتھ رہے۔ بلکہ انھوں نے چنیدہ لوگوں کے خاکے لکھے۔ خاکہ نگاری کے بارے میں ان کے

نظریئے کا اندازہ ااس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے۔ایک دن خلیق ابرہیم خلیق کے گھر دعوت میں خلیق صاحب کی بیگم نے احمد بشیر سے کہا، بشیر صاحب ایک مضمون خلیق صاحب پر لکھ دیجئے۔انھوں نے جواب دیا'' بھابھی میں خلیق پر کیا لکھوں وہ ایک شریف آدمی ہے اب ایسے شریف آدمی پر کیا لکھا جاسکتا ہے جس نے زندگی میں کوئی حرکت ہی نہ کی۔اگر یہ کہا جائے کہ خاکہ سوانح نگاری اور تعارفئے کے درمیان کی چیز ہے تو احمد بشیر کے خاکے اس تعریف پر پورے اترتے ہیں۔خاکہ نگاری میں ان کا انداز تحریر اپنا ہی ہے۔جو جتنا تندوتیز جملوں اور حقائق کے بیان سے عبارت ہے۔وہ خاکہ لکھنے سے پہلے شخصیت کا مکمل مطالعہ کرتے ہیں اور اس میں خاکہ نگاری کے اوصاف اور عناصر تلاش کرتے۔جب انہیں مطلوبہ مواد مل جاتا۔تو پھر وہ بے دھڑک ہوکر نہایت بے باکی سے ان کا قلم قرطاس پر خراشیں ڈالنے لگتا۔مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا قلم کھردرا ہے۔بلکہ خاکہ نگاری میں ان کا نظریہ فن یہ ہے کہ پڑھنے والوں کے سامنے اس شخصیت کا مکمل خاکہ آنا چاہئے۔کیونکہ قاری خاکہ نگار سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ شخصیت کے صحیح خدوخال واضح کرے۔چنانچہ ان کے لکھے ہوئے خاکے دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ وہ نہایت دیانتداری اکے ساتھ قاری کا مطالبہ پورا کرتے ہیں۔البتہ ایک بات طے ہے کہ انھوں نے کوئی بھی خاکہ باقاعدہ منصوبہ بندی کرکے نہیں لکھا۔

خاکہ نگاری کے نقادوں نے پروفیسر رشید احمد صدیقی اور سعادت حسن منٹو کو اردو کے بڑے مرقع نگاروں میں شمار کیا ہے۔ان دونوں کے بارے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ وہ دونوں کے ذہنوں میں خاکہ نگاری یا مرقع نگاری کا جو تصور تھا وہ ایک دوسرے سے مختلف تھا۔رشید احمد صدیقی کا کمال یہ تھا کہ وہ اپنی پسندیدہ شخصیت کو دوسرے کی پسندیدہ بنادیتے تھے۔جبکہ سعادت حسن منٹو ادب کی اس صنف کو زیر گفتگو شخصیت کے پوسٹ مارٹم کے لیے استعمال کرتے تھے لیکن رشید احمد صدیقی اور سعادت حسن منٹو نے جیسے خاکے اور مرقع لکھے ہیں ان کی انفرادیت اور دلکشی اسے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح اردو خاکہ نگاری میں طویل مکالمہ آرائی کا رواج نہیں۔اس اعتبار سے ان کے خاکہ نگاری کا انداز اپنا ہی ہے۔مگر خاکہ نگاری کی غایت پوری کرتا ہے۔اس لیے ان کی تحریروں کو اس صنف سے خارج نہیں کیا جاسکتا اور ان کے خاکوں کی دلکشی اور افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ان کے بعض خاکوں میں دیگر معاصر شخصیات کی نفسیات اور خیالات پر بھی روشنی پڑتی ہے مثلاً 'میرا جی' کے خاکے میں میرا جی کے حوالے سے ان کے معاصر سعادت حسن منٹو کے کردار کی بھی جھلک بھی ملتی ہے۔ملاحظہ کیجئے:

> ''اس زمانے میں منٹو بھی بمبئی میں تھا اور میرا جی بعض شامیں اس کے ساتھ گزارا کرتا تھا۔ایک دن میرا جی پہنچا تو منٹو شراب پی رہا تھا۔بوتل خالی ہو رہی تھی۔میرا

جی کے لیے اس میں سے آخری پیک نکلا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میز پر ایک
سالم ادھا رکھا تھا۔ میراجی نے قدرتی طور پر نظر ڈالی۔ منٹو نے انکار کر دیا لیکن میرا
جی نے بوتل اٹھائی اس پر منٹو نے اسے گالیاں دیں۔ اور گھر سے نکال دیا۔ شاید
اس بے عزتی کو میراجی نے شدت سے محسوس کیا"۔

مولانا حسرت موہانی کے خاکے میں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال ملتی ہے۔ مولانا کے حوالے سے انھوں نے اکبرالہٰ آبادی کی جھلک بھی دکھائی ہے۔ احمد بشیر کے الفاظ میں مولانا حسرت موہانی کی روایت ملاحظہ ہو۔

"بھئی فرماؤں کیا۔ تم جانتے ہی ہو ان کا کلام موجود ہے۔ آدمی بے پناہ تھے۔
انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور گول مول اشاروں سے کام کی باتیں کر جاتے
تھے۔ انگریزوں سے ڈرتے بھی بہت تھے۔ اس لیے بھی ان کا بہت سا کلام
سامنے نہیں آ سکا۔ بات ان کو خوب سوجھتی تھی۔ محفل میں بات کرتے کرتے
جہاں کسی نے ان کے ڈھب کی بات کی انھوں نے وہیں شعر کہہ دیا۔ افسوس! کیا
آدمی تھے۔ میں الہ آباد جیل سے رہا ہوا کانپور کو گاڑی شام کے وقت جاتی تھی۔
سوچا چلو اکبر سے مل لوں۔ ان کے پاس پہنچا تو وہ لپٹ گئے اور رو ئے۔ انھوں
نے ماش کی دال اور تیل منگوایا اور دال کے کچھ دانے نیک شگون کے طور پر تیل
میں ڈالے۔ یہ رسم اودھ میں جانے کب سے چلی آتی ہے۔ لیکن اسے ماں بہنیں
پورا کرتی ہیں۔ اکبر کو مجھ سے ایسی محبت تھی کہ انھوں نے خود کی"۔

اگلے صفحات میں ہم احمد بشیر کے تحریر کردہ خاکوں کے واحد مجموعے "جو ملے تھے راستے میں" کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔ احمد بشیر نے یہ خاکے ۱۹۴۸ سے لے ۱۹۶۰ تک کے دورانئے میں لکھے۔ (ممتاز مفتی کا خاکہ بعنوان "سورما" انیس سو پینتالیس میں لکھا گیا جو ممتاز مفتی کے افسانوں کے مجموعے "چپ" میں انیس سو چھیالیس میں چھپا) گیا اور یہ خاکے مختلف رسائل اور اخبارات میں چھپ چکے تھے ۔ایک طویل عرصہ تک یہ خاکے اخبارات اور رسائل میں چھپے رہے پھر اچانک ان کو یونس جاوید میسر آ گیا اور یہ تحریریں کتابی پیراہن میں عوام الناس کے سامنے آ گئیں۔ احمد بشیر کو لکھنے اور چھپوانے کا شوق تو تھا ہی کہ یہ ہر فنکار کی فطرت رہی ہے۔ مگر جہاں تک کتابی صورت میں اپنی تحریروں کو یک جا کرنے کی بات ہے۔ انھیں یا تو اس کا شوق نہیں تھا یا پھر انھیں اس کی فرصت نہ تھی مگر ڈاکٹر یونس جاوید نے ان سے اصرار کر کے ان خاکوں کو کتابی شکل میں لانے پر نہ صرف آمادہ کیا بلکہ ذاتی دلچسپی لے کر انھیں ترتیب دیا۔

کتاب کے آغاز میں "میں کیوں لکھتا ہوں" کے عنوان کے تحت انھوں نے جو لکھا ہے۔وہ پرنٹ میڈیا کے بعض لوگوں کے لیے باعث شرم بھی ہے اور لمحۂ فکر یہ بھی ہے۔جن کے رسائل و روزنامے جن اہل قلم سے عوام میں مقبولیت کا مقام پاتے ہیں مگر اہل قلم کی مالی حالت بدستور دگرگوں رہتی ہے۔جن اخبارات کے صفحات پر انسانیت اور انسانی حقوق کے متعلق بڑے بڑے بیانات چھپتے ہیں۔ ان کی ناک کے نیچے کیا کیا ظلم ہوتے ہیں۔احمد بشیر اپنی اس ادبی تصنیف میں بھی براہ راست سچ لکھنے سے باز نہیں آئے۔انھوں نے اس تحریر میں بڑے دکھ سے بتایا ہے کہ انہیں لکھنے کا معاوضہ یا تو ملتا نہیں اور اگر ملتا بھی ہے تو انتہائی کم اور ذلت آمیز طریقے سے۔اس ضمن میں کہتے ہیں۔

"۔۔۔جن کی فرمائش پر لکھتا ہوں وہ لکھنے کا معاوضہ نہیں دیتے۔،دیتے ہیں تو اس طرح جیسے میرے باپ دادا پر احسان کرتے ہیں۔پھیرے ڈلواتے ہیں۔ نظر چرا کر نکل جاتے ہیں۔بس کے ٹال دیتے ہیں۔آئندہ جمعرات کا وعدہ کر دیتے ہیں۔۔۔"

آگے چل کر لکھنے میں اپنی عدم دلچسپی یا بے قاعدگی کی ایک وجہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں۔وہ ان رسائل میں نہیں چھپتا جو عامۃ الناس میں پڑھے جاتے ہیں چنانچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ احمد بشیر کا یہ مجموعہ ڈاکٹر یونس جاوید ہی کی عرق ریزی اور جگر پاشی کا رہین احسان ہے۔احمد بشیر نے کتاب کے آغاز میں یونس جاوید کو ان الفاظ میں تحسین پیش کی ہے۔

"پیارے یونس جاوید صحافت میں میرا اچھا خاصا نام تھا۔تم نے میری پرانی دھجیاں جمع کر کے کتاب بنا دی۔اب اگر ادیبوں کے قافلے نے مجھے قبول نہ کیا تو؟"(۱)

یونس جاوید اس مجموعے کے ابتدا میں "جوگی" کے عنوان سے اس کتاب کی تیاری کے سلسلے کی روداد اور احمد بشیر سے اپنے تعلقات اور ان کے حسن سلوک اور شفقتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

" احمد بشیر نے میرے لیے آپ کے لیے اس وطن کے لیے۔سب کے لیے اتنا کچھ کیا، کہا سنا اور لکھا کہ مجھے ان کے لیے تھوڑی سی خدمت کرتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے۔ایسی مسرت جو کسی تخلیقی کاوش کے بعد نصیب ہوتی ہے۔یہ میرے جواہرات ہیں۔جواہر پارے ہیں۔جو لگ بھگ آدھی صدی پر محیط رسائل و

اخبارات میں پڑے کرم خوردگی کا شکار ہونے کو تھے کہ میں نے انہیں چن لیا۔
اس لیے کہ تخلیقی سطح کے یہ جواہر پارے اپنی تکمیل چاہتے تھے''۔(۲)

ڈاکٹر صاحب نے یہاں کسرنفسی سے کام لیتے ہوئے اپنی کاوش کو تھوڑی سی خدمت' کا نام دیا ہے ورنہ اس کاروگر میں انھیں کن کن کٹھنائیوں سے گزرنا پڑا اس کا اندازہ ہر محقق و مدون بہ آسانی کر سکتا ہے۔اس کے لیے وہ اہل علم وادب کے ہمیشہ مشکور رہیں گے۔۲۹۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے ابتدائی دس صفحات کتاب کا نام چھاپنے والے ادارے کا نام''میں کیوں لکھتا ہوں'' کے حوالے سے احمد بشیر کی باتیں، یونس جاوید صحافی سے ادیب بننے کا ذکر ممتاز مفتی کے نام انتساب ان الفاظ میں ہے:

پیارے ممتاز مفتی
میں نے تمہیں عقل سکھائی
تم نے مجھے جنون
ہم دونوں ناکام رہے

پہلے ایڈیشن میں جو گورا پبلشرز لاہور سے شائع ہوا، دیباچے کے طور پر ان کی کوئی تحریر نہیں شامل تھی مگر دوسرے ایڈیشن میں، جو الفیصل ،لاہور نے مارچ ۲۰۰۳ شائع کیا اس میں پیش لفظ ('' پھر رہا ہے شہر میں مُلّا کھُلا'') شامل ہے اور پھر دوسرے نمبر پر یونس جاوید کا'' جوگی'' ہے۔ کسی کے فن کو سراہنے کے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان اسی کے طرز نگارش میں اس کی توصیف وتنقید کرے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یونس جاوید نے احمد بشیر کے تعارفی خاکے میں احمد بشیر ہی کا انداز اختیار کیا ہے جوگی کے بارے میں پروفیسر جیلانی کامران لکھتے ہیں :

> Younas Javaid has added an introductory chapter to book, and has in all fairness provided a critical portrait of the authore himself which is interesting in particular sense that he has adopted Ahmad Bashir's style of writing , and has also in that manner defined and described Ahmad Bashir as Yogi----"(3)

اور پھر ممتاز مفتی کا احمد بشیر پر لکھا ہوا خاکہ'' غنڈہ'' ہے۔

پھر رہا ہے شہر میں ملا کھلا: جب یہ مجموعہ چھپ کر منظر عام پر آیا تو شہر کے ادیبوں نے تو اسے

ہاتھوں ہاتھ لیا، پسند کیا گیا۔اس کی اہمیت اور ادبی حیثیت تسلیم کی گئی مگر طرفہ تماشا یہ ہوا کہ چراغ حسن حسرت کے خاکے میں جو انھوں نے بازار حسن کی واردات بیان کی تھی اس کے خاکے کے مندرجات پر ملک کے علماء نے ان پر کفر کا فتویٰ لگا کر انہیں واجب القتل قرار دے دیا۔ جس کے بعد انہیں ہر طرف سے نامعلوم افراد کی دھمکیاں ملنے لگیں۔جس پر انھوں نے اپنے تحفظ کے لیے عدالت سے رجوع کیا مگر عدالت نے اخباری بیان پر مذکورہ مفتیان کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے انکار کر دیا(۴) لیکن حکومت کو احمد بشیر کے تحفظ کی ہدایت کی۔لاہور کے ۳۷، ادیبوں نے احمد بشیر پر فتویٰ کفر لگانے پر اپنا مذمتی ردعمل دیا اور کالم لکھے قراردادیں پاس کیں۔ان میں حامد میر، قتیل شفائی، آئی اے رحمان، اعجاز حیدر، صفدر میر، منو بھائی، مظفر علی سید، خالد احمد، سرفراز سید، انتظار حسین، احمد ندیم قاسمی، ظفر اقبال، اصغر علی گھرال، ظفر صمدانی اور دیگر شامل ہیں۔اس دوران پریس مالکان اور اخباروں کے مالکان کا رویہ ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھا کیونکہ کوئی بھی احمد بشیر کا جوابی مضمون چھاپنے کو تیار نہ تھا۔ بھلا ہوا ان نامجاروں کا جن کی ''زبان درازی'' ان کے قلم سے'' پھر رہا ہے شہر میں ملا کھلا'' جیسی تحریر لکھوانے کا باعث بنی۔ یہ تحریر ظاہر ہے کتاب کے پہلے ایڈیشن میں شامل نہیں ہے۔اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں:(۵)

> ''یہ مضمون میں نے روزنامہ پاکستان کے کہنے پر لکھا تھا کیونکہ مولویوں نے اسی محاذ سے میرا نشانہ لیا تھا۔مگر مضمون پڑھ کر ایڈیٹروں کی گھگی بندھ گئی۔۔۔مولویوں سے سب ڈرتے ہیں۔کیونکہ ان کے پاس زبان اور لہجہ ہے اور جمعے کے جمعے منبر پر بھی وہ گرجنے برسنے کے عادی ہیں۔اور کسی سے تو امید نہ تھی کہ وہ اسے چھاپ دے کیونکہ وہ تو خالی خبر چھاپنے پر تیار نہ ہوئے تھے۔پھر میں نے سوچا کہ میں نے ''جو ملے تھے راستے میں'' کا دیباچہ نہیں لکھا تھا، اب تو میرے پاس کہنے کو کچھ ہے۔دوسرے ایڈیشن میں اسے بطور دیباچہ شامل کر دوں تاکہ باشعور قاری تک میرا موقف پہنچ جائے۔'' ''پھر رہا ہے شہر میں ملا کھلا''۔۔۔اس تحریر کو'' ملائی عبد'' کا خاکہ قرار دیا جا سکتا ہے۔جسے پڑھ کر بے اختیار اقبال کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے۔

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ

پیش لفظ کے تحت لکھے گئے اس تحریر میں بھی ان کا لہجہ براہ راست درشتی اور طنازی سے بھرپور ہے۔اور انھوں نے اسلامی تاریخ کے حوالہ جات دیتے ہوئے ادوارِ ملوک میں ملائیت کے مہلکات کا تسلسل ثابت کیا اور انھوں نے ملاؤں کے خوب لتے لیے۔اس تحریر کو پڑھ کر احمد بشیر کا قاری بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔یہ سب کچھ احمد بشیر ہی کا قلم لکھ سکتا ہے ۔ہوسکتا ہے کہ یہ طاقت کئی اوروں کے قلم میں بھی ہو۔دلیر اور بھی ہوں گے ۔مگر احمد بشیر کی سی علائق دنیا سے اور ذاتی مفاد سے اتنی بے نیازی کم کم اہلِ فکر و اہلِ قلم میں ہوگی ۔ یہاں چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں ۔جن سے اس مضمون کی نوعیت اور درجۂ حرارت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

''میں نے دیکھا ہے کہ بھاٹی دروازے میں سے صبح سویرے مولوی صاحبان ہیرا منڈی کی طرف جاتے ہیں۔۔۔وہ مولوی صاحبان گانے والیوں کے بچوں اور بچیوں کو قرآن شریف پڑھانے اور نماز سکھانے کے لیے جاتے ہیں اور اس خدمت کے عوض طوائفوں کی حرام کی کمائی میں سے کچھ معاوضہ بھی وصول کرتے ہیں۔ یہ مولوی صاحبان، مولانا عبدالقادر آزاد (موصوف ایک طویل عرصے تک بادشاہی مسجد کے خطیب رہے)۔ڈاکٹر اسرار احمد اور مولانا مرتضیٰ ملک کی طرح بے فکرے اور خوشحال نہیں ،غریب محنت کش ہیں اور ان کو روزی کمانی پڑتی ہے۔۔۔آٹھ سو سال قبل بغداد کی تباہی کے بعد جب انہی مولویوں نے اجتہاد کا دروازہ بند کر کے اللہ اور رسول ﷺ سے بغاوت کی اور مسلمانوں کو جہالت اور ماضی پرستی کے اندھے کنویں میں ہمیشہ کے لیے بند کر دیا تو اسلام کا تخلیقی بہاؤ گندے جوہڑ کی صورت اختیار کر گیا،مولوی جس پر بدبودار کائی کی طرح جمے بیٹھے ہیں۔'' (٦)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''۔۔۔یہ وہی تو ہیں جنہوں نے یزید کو فتویٰ دیا تھا کہ قتلِ حسینؓ جائز ہے۔جنہوں نے مامون الرشید کے استفسار پر فتویٰ دیا تھا کہ قرآن حادث ہے قدیم نہیں ۔۔۔یہی تو ہیں جنہوں نے امام ابوحنیفہؒ کو کوڑے لگوائے تھے ۔۔۔جنہوں نے ہلاکو خان کو جب وہ بغداد کے در و دیوار کو خونِ مسلم سے رنگین کر چکا تھا، بادشاہ عادل کا خطاب دیا تھا۔۔۔منصور کو سولی پر لٹکایا۔سرمد شہید کی

گردن کاٹی، شاہ حسین کو کافر کہا اور بلھے شاہ کو پتھر مارے۔ یہ وہی تو ہیں جنہوں نے اکبر بادشاہ کو مجتہد قرار دے کر اپنی شریعت ایجاد کرنے کا اختیار دیا تھا ۔۔۔ یہ وہی تو ہیں، جنہوں نے دلی کی تباہی پر انگریزوں کے ہاتھ چومے تھے اور ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک فتوے کی روشنی میں حکم دیا تھا کہ وہ انگریزوں کی اطاعت کریں کیونکہ وہ اہل کتاب ہیں۔۔۔۔"(۷)

مضمون کا اختتام ملاحظہ کریں۔

"میرے وجوب قتل کے فتوے پر کسی اخبار نے کچھ نہ لکھا، کوئی نہ بولا۔ سب کے دفتروں پر حملے ہو چکے ہیں۔ سب مفتوحہ ہیں۔ سب چپ ہیں۔۔۔ پھر رہا ہے شہر میں ملا کھلا۔"(۸)

انٹرویو (چراغ حسن حسرت)

یہ چراغ حسن حسرت کا خاکہ ہے۔ ان کا قلم یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ شخصیت کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنے قاری کے سامنے شخصیت کا ایک پہلو ۔۔ جو کہ اس کی شخصیت کا غالب پہلو ہوتا ہے۔۔ رکھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ پھر کسی واقعے کے بعد اس شخصیت کے ایک اور پہلو کی چھب دکھا کر قاری کو لبھاتے ہیں اور ۔۔۔۔! ان کے خاکوں میں واقعیت کا حسن منظر نگاری سے نکھرتا ہے۔ نمونہ چراغ حسن حسرت کے خاکے "انٹرویو" ملاحظہ کریں:

ان کی خاکہ نگاری میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ لفظوں سے تصویریں بناتے ہیں۔ ان کے اکثر خاکوں میں ایسے واقعات یا مناظر کا بھی تذکرہ ملتا ہے جن کا مذکورہ شخصیت سے براہ راست تعلق نہیں ہوتا۔۔ انٹرویو۔۔ میں اپنی مولانا چراغ حسن حسرت سے اپنی پہلی ملاقات کی رپوتاژ ملاحظہ کریں۔

بمبئی میں آپ کیا کرتے تھے۔۔۔۔۔

میں کرشن چندر کے گھر رہتا تھا جی اور ان سب سے ملتا تھا جو اسے ملنے آتے تھے۔

کرشن چندر کہانی لکھ لیتا ہے مگر زبان اس کو نہیں آتی۔ کیا خیال ہے؟

زبان تو مجھے بھی نہیں آتی جی۔

آپ کرشن چندر بھی تو نہیں ہیں۔ آپ کہانی بھی تو نہیں لکھ سکتے مولانا۔۔ یا لکھ سکتے ہیں۔

میں کچھ بھی نہیں لکھ سکتا جی۔
اور آپ اخبار میں نوکری کے لیے آ ئے ہیں کس برتے پر؟
کسی برتے پر نہیں جی۔ نہ دیجئے نوکری پھر۔
مولانا کو اس بے اعتنائی پر بڑا تعجب ہوا۔ بڑے غمگین لہجے میں انھوں نے
پوچھا' کلرکی کی نوکری ہی کریں گے آپ؟
جی نہیں، میں نے جواب دیا۔''(۹)

جس واقعے کی وجہ سے ملاؤں کا تقویٰ ان پر چڑھ دوڑا تھا وہ یہ سطور تھیں جن میں احمد بشیر نے مولانا کے جام سے جام ٹکرانے کا ذکر کیا تھا:

''۔۔۔اتنے میں وہسکی آ گئی اور مولانا اور میں جام ٹکرا ٹکرا کر پینے لگے۔ دو پیگ کے بعد مولانا کچھ اور کھل گئے مگر ان کے رکھ رکھاؤ اور آداب میں کوئی فرق نہ آیا۔ دس بجے جب مولانا اور میں سات سات پیگ پی چکے تو مولانا نے کہا، اب ذرا ادھر کی بہاریں بھی دیکھیں۔ آخر ان لوگوں کی کفالت بھی کسی کا فرض ہے۔۔کوٹھے پر مولانا گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ گئے ان کی فرمائش پر لڑکی نے دیس کا الاپ شروع کیا۔ فوراً مولانا نے کومل تیور کی بحث چھیڑ دی۔ کوثر خاموش ہوگئی۔ استاد جی گھبرا گئے۔' دیس میں نکھاد کومل لگتا ہے۔ خاتون نے تیور لگایا کیوں مولانا کوثر صاحبہ۔' استاد جی بولے۔' بجا ارشاد مگر دیس میں نکھاد تیور ہی لگتا ہے ہمارے ہاں جناب۔ حضور خود گنی ہیں۔ سننے والے ہیں۔' مولانا کچھ شبے میں پڑ گئے مگر مانے نہیں۔ میں ان کے ساتھ ہی بیٹھا ان کے روپے سنبھال رہا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ دیس میں نکھاد کومل اور تیور دونوں طرح لگانا درست ہے اور راگوں کی شدھ بدھ میں نے گورداسپور میں اپنے طرحدار ماموں کی بیٹھک میں حاصل کی تھی۔ میں نے کہہ دیا۔' دونوں ٹھیک کہتے ہیں۔ دیس میں کومل تیور دونوں لگتے ہیں مولانا۔ مولانا چونکے۔ میں نے جس اعتماد سے رائے دی تھی اس کی وجہ سے مولانا کو مجھ سے الجھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔' بے شک دونوں بھی لگ سکتے ہیں۔' انھوں نے کہا۔' بجا ارشاد' استاد بولا۔' چھوٹے صاحب بہت گنی معلوم ہوتے ہیں۔ ہماری بھی

اصلاح ہوگئی۔ اشارہ پاکر کوثر نے پھر گانا شروع کر دیا۔مولانا اسے نوٹ
دینے اور جھومنے لگے۔رات بہت سہانی ہوگئی۔۔۔(۱۰)

کہنے کو تو انٹرویو میں مولانا چراغ حسن حسرت کے مزاج اور طبع کی تصویر کھینچی ہے مگر'' قلندر''
جو کہ مولانا حسرت موہانی کے بارے میں ہے اس میں بھی احمد بشیر نے مولانا چراغ حسن حسرت کے طور
طریقوں اور مزاج سے ان کا خاکہ بھی کھینچا ہے۔

قلندر (مولانا حسرت موہانی)

یہ خاکہ مولانا فضل الحسن حسرت موہانی سے ملاقات اور تاثرات پر مبنی ہے۔بنیادی طور پر یہ تحریر یادنگاری
کے ذیل میں آتی ہے۔جب وہ روزنامہ امروز میں تھے تب مولانا چراغ حسن حسرت نے بادل نخواستہ
انہیں مولانا حسرت موہانی کے دورۂ لاہور کے موقع پر مہماندار مقرر کیا تھا۔احمد بشیر نے مولانا حسرت
موہانی کے لکھے ہوئے خاکے کے ابتدائی صفحات ،صفحہ ۸۷ سے صفحہ ۹۱ تک کی تحریر اس مجموعے کی طباعت
کے وقت لکھ کر یونس جاوید کو دی جو انھوں نے خاکہ مؤرخہ ۱۳ نومبر ۱۹۵۰ کے آغاز میں شامل کی(۱۱)

مذکورہ تحریر کا آخری پیراگراف ملاحظہ کریں:

''میں مولانا حسرت موہانی کو ایک بہت بڑا آدمی سمجھتا تھا اور مجھے یہ گمان
نہیں تھا کہ وہ میری کسی بات کا برا مان جائیں گے اور انٹرویو تو ہوتا ہی بے تکلفی
کے ماحول میں ہے۔میرا خیال تھا کہ مولانا کی خدمت میں گزارا ہوا ہفتہ خالی
نہیں جائے۔وہ مجھ سے بات چیت پر راضی ہو جائیں گے اور کوئی رنجش کی بات
پیدا نہ ہوگی۔مجھے یہ شوق بھی تھا کہ دیکھوں بہت بڑا آدمی کیسا ہوتا ہے۔جب
مجھے ڈیوٹی ملی تو میں قطعی طور پر فکر مند نہ ہوا۔مجھے اپنے آپ پر اور مولانا
حسرت موہانی پر بھروسہ تھا۔مولانا چراغ حسن حسرت ایسے تھے جیسے انھیں دل
کا دورہ پڑنے والا ہے بہر حال ہم دوسرے دن سٹیشن پہنچ گئے۔'' (۱۲)

اس پیراگراف کے بعد انھوں نے مولانا حسرت موہانی سے اپنی ملاقات اور ان کے سراپے
کا نقشہ یوں کھینچا ہے (اصل خاکہ ان الفاظ سے آغاز ہوتا ہے):

''پاکستان میل کے فسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبے دیکھ کر جب ہم تقریباً مایوس
ہو چکے تو ہم نے دیکھا کہ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے کے سامنے چھوٹے قد کے

بہت ہی ضعیف بزرگ کھڑے ہیں ۔ سر پر چھوٹے کناروں کی ترکی ٹوپی جس
سے پھندنا غائب۔ لمبا اور ڈھیلا سا میلا کرتا، کالے رنگ کا بوسیدہ شلوکا زیب
تن، پاؤں میں معمولی چپل۔ تین چھوٹی چھوٹی تھیلیاں، رسی سے بندھا ہوا میلا
بستر اور ایک کتابوں کا بقچہ پاس پڑا ہے۔ پرانی چھڑی اور بدرنگ بوسیدہ چھتری
ایک ہاتھ میں اور دوسرے میں تھرڈ کلاس کا پیلا ٹکٹ، قلی سے سامان باہر لے
جانے کا معاملہ کر رہے ہیں ۔ یہ ضعیف اور درویش منش بزرگ، براعظم ہند
پاکستان کے عظیم سیاسی راہنما اور گذشتہ نصف صدی کے عظیم غزل گو اور نقاد
حضرت مولانا حسرت موہانی تھے۔" (۱۳)

ریاض احمد ریاض "قلندر" کے بارے میں کہتے ہیں:

"حسرت موہانی سے چند دن کی ملاقات رہی اسی ملاقات کا احوال اس انداز
سے بیان کیا گیا ہے کہ مولانا کی زندگی کے کئی پوشیدہ گوشے ہمارے سامنے وا
ہوتے ہیں حتیٰ کہ مولانا کی موسیقی سے دلچسپی، پتنگ اڑانے، پیچ لڑانے، شبلی
کے ساتھ عطیہ فیضی کو ملنے جانے، علی گڑھ میں حالی، ڈاکٹر نذیر، مولوی ذکا اللہ کی
صحبتوں سے فیض اٹھانے، سجاد حیدر یلدرم، پروفیسر ظریف، رتن ناتھ سرشار،
استاد داغ، سر عبدالستار، علامہ اقبال اور سروجنی نائیڈو سے ملنے ملانے کے
واقعات بھی اس انٹرویو نما ملاقات میں سمٹ کر خاکے کے رنگ ڈھلے دکھائی
دیتے ہیں۔" (۱۴)

اکیلا (میراجی)

ایک کامیاب خاکہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ شخصیتِ مذکور کو اگر مکمل طور پر نہیں تو اس کے چند ایک پہلوؤ
ں کو اس طرح بیان کرے کہ قاری کے ذہن میں اس شخصیت کے خدوخال واضح ہونے لگیں۔ احمد
بشیر کے خاکوں میں کیونکہ بے ساختگی ہے۔ اس لیے خاکہ نگاری کی مذکورہ صفت ان میں بخوبی پائی
جاتی ہے۔ وہ بڑی تسلی اور تفصیل سے خاکے میں ایسا ماحول اور ایسا منظر تخلیق کرتے ہیں کہ قاری
مذکورہ شخص کے بارے میں اپنے ذہن میں ایک تصویر بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد
جوں جوں وہ خاکہ پڑھتا جاتا ہے وہ تصویر اس کے سامنے متحرک اور الفاظ بولنے لگتے ہیں۔ میراجی

کے خاکے میں احمد بشیر نے میراجی کی شخصیت کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔ میراجی کے مزاج، آدرش، معمولات، نظریۂ فن اور یہاں تک کہ میراجی نے جو عشق کیے ان کا بیان اور نفسیاتی سطح پر میراجی کے حوالے سے تجزیہ بھی اس خاکے کو ان کے دوسرے خاکوں کی طرح معتبر اور میراجی کے بارے میں دلچسپ مطالعاتی مضمون بنا دیتا ہے۔ چند اقتباسات دیکھیے جو میراجی کی شخصیت کے دالان میں روزنوں کی طرح کھلتے ہیں:

''میراجی لذت کا غلام تھا۔ وہ جو انانیت سے حاصل ہوتی ہے۔ اس نے اپنے شبستان عیش کے دروازے صرف اپنی ذات پر ہی کھولے اور کسی کو اس میں جھانکنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ دنیا کے جھمیلوں سے بے نیاز اپنی ذات میں چھپ کے چوری چوری لذت لیتا رہا اس نے ساری زندگی اپنی ذات کی بندگی میں گزاری۔ اس نے کبھی اپنے آقا کو ناراض نہیں کیا۔ اس کا یہ جذبہ اتنا قوی اور خود مختار تھا کہ وہ خود اپنی تسکین بن جاتا تھا اور خارجی ذرائع کی ضرورت کا احساس بھی پیدا نہ ہونے دیتا تھا اور اس نے پوری عمر انسانوں کے بھرے جنگل میں گزاری۔ مگر خود ایک بے برگ و بار درخت بن کر اکیلا کھڑا رہا اس کو اس بات کا بھی ملال نہیں تھا کہ زرد کانٹوں کی نوکوں پر پتیاں نہیں اُگ سکتیں اور کوئی تھوہر کے سائے میں نہیں بیٹھ سکتا۔ اسے اپنی انا سے فرصت کہاں تھی کہ وہ اوروں کا غم کھاتا۔ وہ اپنے خول سے باہر بھی نہ نکل سکا۔ اس شبستان عیش کے خول میں ساری عمر اس نے اپنے آپ کو قید رکھا۔'' (۱۵)

میراجی کو کسی مذہب سے واسطہ نہ تھا۔ اسے انسانوں سے ظاہری ہمدردی تھی۔ ایسی ہمدردی جیسی راہ چلتے کسی روتے ہوئے بچے سے ہو جاتی ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، سب میراجی کے لیے روتے ہوئے بچے تھے۔ وہ ان روتے ہوئے بچوں کو دیکھتا اور اپنی راہ چلتا رہتا۔ اسے مذہبوں، قوموں سے نہیں بل کہ بعض ذہنوں سے نفرت تھی۔ (۱۶) میراجی نے دنیا چھوڑ کر لذت پرستی نہ چھوڑی۔ اس نے لذت کشی کے تمام تقاضے پورے کیے۔ لذت کو وہ روحانیت کی معراج سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس کاوش میں اس کا جسم آزردہ اور روح آسودہ رہی۔ لذت کے تقاضے پورے کرنے میں اسے بہت دسترس تھی بلکہ اس سلسلے میں اسے ''ید بیضا'' عطا ہوا تھا۔۔۔۔ (۱۷) عورت اس کے لیے ایک بے معنی اور مجہول شے تھی جسے اس نے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ اس حقیقت کے باوجود میراجی نے

دو تین مرتبہ عورت سے مصالحت کی کوشش کی۔ اگر چہ مصالحت کی یہ کوشش سرسری اور محض تجرباتی تھی۔ ۔۔۔ سب سے پہلی عورت جس کی طرف میرا جی نے رغبت ظاہر کی وہی میرا سین تھی جس نے اسے میرا جی بنایا۔ میرا جی نے اس سے بھرپور عشق کیا مگر اس کا عشق بھی ناقابل فہم تھا۔ اس نے کبھی عمر بھر میرا سین سے بات بھی نہ کی۔ اس کی طرف آنکھ بھر کے دیکھا بھی نہیں اور ساری زندگی اس کے نام پر تج دی۔۔۔ میرا جی کہا کرتا تھا کہ اسے میرا سے بات کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا تھا۔ مگر میرا خیال ہے وہ یہ محض زیب داستاں کے لیے کہا کرتا تھا۔ دراصل اس نے کبھی دل سے چاہا ہی نہ تھا کہ میرا سے عشق کا اظہار کرے۔ اس کا مقصد تو چھپ چھپ کے لذت لینا تھا۔ میرا تو محض ایک بہانہ تھی۔ اس قسم کے بہانے زندگی میں اس نے اور بھی بنائے جس میں ایک بہانہ ایک ادیب خاتون سے عشق تھا۔۔۔ اس کا تیسرا بہانہ بادل نام کی ایک شاعر خاتون تھی۔ (۱۸)

چھپی (احسان دانش) (۱۹)

احمد بشیر کے خاکے میں منظر نگاری اور لفظوں کے ذریعے بنی ہوئی تصویریں دیکھنی ہوں تو ''چھپی'' میں احسان دانش کے گھر چلے جائیں۔ انداز ملاحظہ ہو:

> ''احسان کو گھر پر ملنا آسان کام نہیں۔ کیونکہ وہ گھر پر ملتا ہی نہیں۔ مل جائے تو آپ کو دیکھ کر باہر آ جائے گا۔ لیکن کسی طرح اس کے گھر کے اندر جانے کا اتفاق ہو بھی جائے تو آپ دیکھیں گے کہ اس کا گھر کبوتر خانہ، پنساری کی دکان اور مسجد کا دلچسپ امتزاج ہے۔ اس کے گھر میں زیادہ تر تخت پوش کتابیں، کبوتر کی چھتریں، ٹین کے ڈبے، پرانے قلمدان اور جائنمازیں دکھائی دیتی ہیں۔ کہیں کہیں ایک آدھ برتن یا ایک آدھ لحاف ملتا ہے جس کی موجودگی سے شک پڑتا ہے کہ وہ گھر ہے۔۔۔ دیواروں پر سفیدی نام کو نہیں، لکڑی لوہے کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ گھڑے گویا کالی مٹی کے بنے ہیں۔ تمام چیزوں پر سیاہی ملی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جانے ان چیزوں کا احسان پر عکس پڑتا ہے یا احسان کا ان چیزوں پر۔ لیکن اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ احسان نے گھر کا کل سامان ایک خاص کلر سکیم کے مطابق جمع کر رکھا ہے۔'' (۲۰)

احمد بشیر نے احسان دانش کے گھر، کمرے میں آویزاں ایک دلچسپ نوٹ اس خاکے میں

نقل کیا ہے۔احمد بشیر کی تحریروں میں مزاح کا عنصر بالعموم عنقا ہوتا ہے مگر اس خاکے میں لکھے گئے اس نوٹ میں، جسے انھوں نے شوخی سے سنگین عبارت لکھا ہے، قاری کے زیر لب مسکرانے کا سامان موجود ہے۔:

''نوٹ

میرا کوئی عزیز یا دوست اپنے آپ کو مندرجہ ذیل اصولوں سے مستثنیٰ نہ سمجھے:

ا۔ میں تفریحی گفتگو کو تضیع اوقات سمجھتا ہوں، اس لیے کوئی صاحب تفریحی گفتگو سے اپنا وقت ضائع نہ کریں۔

۲۔ کوئی صاحب دس منٹ سے زیادہ نہ بیٹھیں، طویل گفتگو کے لیے پہلے سے وقت لیا جائے۔

۳۔ کوئی صاحب میری کسی کتاب کو الٹ پلٹ نہ کریں

۴۔ کوئی صاحب مجھ سے میری کوئی کتاب مفت طلب نہ کریں

۵۔ مشاعرے میں شرکت کی دعوت دینے والے حضرات سے ۳۰۰ روپے نقد اور آنے جانے کا سیکنڈ کلاس کا کرایہ پیشگی لیا جائے گا۔

احسان دانش''(۲۱)

اس کے بعد احمد بشیر نے لکھا ہے کہ یہ بات ان کے لیے نا قابل فہم ہے کہ یہ محض نوٹ ہے اس پر کوئی عمل نہیں کرتا۔ جو بھی آتا ہے وقت ملاقات طے کیے بغیر ہی آتا ہے۔ اپنی من مانی کرتا ہے۔ گپیں مارتا ہے، شور مچاتا ہے، سگریٹ پیتا ہے اور کتابیں پھاڑتا ہے۔ احسان دانش سے کوئی دوست کتاب طلب نہیں کرتا بلکہ خود ہی اٹھا کر لے جاتا ہے۔ احسان دانش اپنا کرایہ خود دے کر مشاعرے میں جاتا ہے اگر اپنے پاس نہ ہو تو کسی سے مانگ لیتا ہے۔ احسان دانش کا یہ باوقار خاکہ احسان دانش کی شخصیت کا بھرپور عکس اور جہان دانش کی یاد دلاتا ہے۔

شعبدہ باز (ظہیر کاشمیری)

ظہیر کاشمیری کے خاکے کا سابقہ عنوان۔ جادوگر۔ تھا۔ اس خاکے میں ان کا انداز تحریر ایک بار پھر ان کے کہنہ مشق اور مشاق خاکہ نگار ہونے کی بہترین مثالیں پیش کر رہا ہے سراپا ملاحظہ کریں؛

''اس کی وضع قطع اور شکل وصورت ایک سوچی سمجھی ہوئی کلر سکیم کے مطابق ہے

۔ جیتے جاگتے انسان سے کہیں زیادہ وہ ایک روغنی تصویر معلوم ہوتا ہے۔ اسکے خدوخال میں ایک گولائیوں بھرا نظام ہے۔ چہرہ چھلا ہوا، ناک مڑی ہوئی، دانت چوہے کی طرح کٹیلے، آنکھیں بھوری اور اندر کو بیٹھی ہوئیں، ہونٹ پتلے اور کمان کی طرح اندر کو جھکے ہوئے، رخساروں پر چیچک کے گھلے گھلے داغ جو دور سے دکھائی نہیں دیتے، لہریا بالوں اور مخروطی داڑھی کا رنگ میلے اور پرانے خون سے مشابہ۔ اس کے وضع قطع اور شکل وصورت کو خوب صورتی یا بدصورتی سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔‘‘(۲۲)

جن لوگوں نے ظہیر کاشمیری کو دیکھا ہوا ہے وہ جب اس سراپا نگاری کا مطالعہ کرتے ہیں تو لفظوں میں ظہیر کاشمیری کی چلتی پھرتی بولتی اور اپنی ادائے خاص دکھاتی ہوئی شخصیت متحرک دکھائی دینے لگتی ہے۔ خاکہ نگار لفظوں سے تصویریں ہی نہیں بناتا بلکہ اس کے لئے لفظوں کا استعمال بھی اسی قدر اہم ہوتا ہے جیسے کسی مصور کے لئے کوئی تصویر کینوس پر اچھالتے ہوئے رنگوں کا انتخاب۔ منقولہ بالا اقتباس میں ہمیں الفاظ کے استعمال میں یہی قرینہ ملتا ہے۔ اب ظہیر کاشمیری کے روزمرہ مشاغل اور طرز تکلم اور معمولات کے بارے میں دیکھئے:

’’ وہ ہوٹل کے بیروں کو مارکسزم پڑھاتا ہے اور ادیبوں کو پان لگانا سکھاتا ہے۔ عورتوں کو فلسفے کے نکتے سمجھاتا ہے، ہیجڑوں کو ٹھمک کے بھاؤ بتاتا ہے۔ وہ ہرفن مولا ہے۔ ہر موضوع اس کا موضوع ہے اور ہر آدمی اس کا معمول ہے وہ ہر بات پر استادانہ تبصرہ کرتا ہے۔ ہر بات پر اس کی انگلی اٹھ جاتی ہے۔ گردن تن جاتی ہے۔ آنکھیں ناچتی ہیں۔ بالوں کے گھنگھر تھرکتے ہیں۔ بات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچتی اور کھلتی ہیں۔ وہ یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ میری انگلیوں میں سیاسی اقتصادی ادبی اور سائنسی انقلاب سوئے پڑے ہیں۔ ابھی میں نے ہاتھ جھٹکا تو جاگ پڑیں گے۔ وہ باتوں کے شعبدوں سے کبھی دماغوں کو دھیان کبھی پتھر کبھی دھند بناتا رہے گا۔ پھر جب آپ مکمل طور پر فتح ہوجائیں گے تو وہ سگریٹ کی راکھ جھاڑ کے وہاں سے چل دے گا۔ ایسی شخصیت جو اپنے آپ کو منفرد رکھنے کے سوڈھنگ جانتی ہو اور جو ہر کسی پر اثر انداز ہونے کی اہلیت سے مالا مال ہو۔ اس کے سارے گنوں سے آشنائی

بذاتِ خود ایک حیران کن تجربے سے کم نہیں اور قاری بھی تجربے کی اس رو میں بہتا چلا جاتا ہے"۔ (۲۳)

سورما (ممتاز مفتی)

احمد بشیر نے پہلا خاکہ ۱۹۴۶ء میں ممتاز مفتی کا لکھا۔ جس کے بعد انھوں نے اس خاکے میں تین دفعہ ترمیم کی۔ ان کا کہنا ہے کہ جب میں نے یہ خاکہ لکھا اس وقت میں کم باشعور تھا۔ یہی باعث ہے کہ انھوں نے اس خاکے میں تین دفعہ ترمیم کی۔ کیونکہ اس وقت تک وہ ممتاز مفتی کے ساتھ ایک طویل عرصہ گزار چکے تھے۔ انھوں نے آخری حاشیہ ممتاز مفتی کی وفات کے بعد لکھا۔ چنانچہ ترمیمی واقعات اور تاثرات کے بعد ممتاز مفتی کا خاکہ ان کی شخصیت کے بارے میں ایک مکمل نفسیاتی تجزیہ پیش کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک بات بڑی دلچسپ ہے کہ ان کے انداز تحریر میں کوئی فرق نہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا لکھنے کا انداز طبع زاد تھا۔ انھوں نے مفتی کے خاکے میں ان کی ذات کی مختلف تہوں میں جھانکا ہے۔ خاکہ مذکور سے چند اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

"۔۔۔ ممتاز مفتی ایک ایسا بچہ ہے جو یہ پسند نہیں کرتا کہ اسے کوئی بچہ سمجھے۔ دل ہی دل میں وہ چاہتا ہے کہ اس کی بیوی اسکی دیکھ بھال کرے اور اسے مناسب وقت پر مناسب کام کرنے پر مائل کرے۔ لیکن یہ سب کچھ اس انداز سے ہو کہ اسے معلوم نہ ہو کہ اسکی دیکھ بھال کی جارہی ہے۔ اگر اسے شک پڑ جائے کہ اس سے ایک بچے کا سا سلوک کیا جارہا ہے تو اکیس سویا ہوا مرد بیدار ہو جائے گا۔ اور اپنی تحریک کے خلاف جہاد کرے گا۔ کیونکہ کسی دوسرے کی مرضی پر چلنا اسے قطعاً گوارا نہیں۔ اس کے برعکس اگر اس کی بیوی اس سے عام بیویوں کا سا سلوک کرے اور ڈر کر رہے تو وہ اسے جاہل، نکمی اور بے عقل سمجھنے لگے گا۔ اسے گھریلو جھگڑوں سے اس قدر نفرت ہے کہ بسا اوقات وہ جھگڑے کے خطرے کو روکنے کے لیے اپنی بیوی سے جھگڑا چھیڑ لیتا ہے۔" (۲۴)

اب ضمیمہ "الف" کی چند سطور دیکھئے:

"ممتاز مفتی ایک من موجی اور مست حال جوگی ہے جو پہاڑ پر رہتا ہے۔ مگر چرخے کی گھوک سن کر اس کی بشریت بیدار ہو جاتی ہے اور وہ دنیا کی لوبھ میں

وادی میں اتر آتا ہے۔ پھر وہ اپنی اندر سجا جماتا ہے۔ حسین لڑکیاں اس کے
پاس بہت آتی ہیں۔ وہ محبتوں کی ماری ہوئی ہوتی ہیں یا خصموں کی ماری ہوئی یا
ماں باپ کی ماری ہوئی یا افسروں کی ماری ہوئی یا تنہائی کی ماری ہوئی
۔۔۔(۲۵) اس کی کیفیت مجھے بہت پیاری لگتی ہے۔ وہ ایک انوکھا اور لاڈلا
شخص ہے۔ آپ اس کے نظریات سے کتنا ہی اختلاف کریں اگر آپ کسی
معاملے میں اس کے رقیب نہیں ہیں تو اس کے حصار سے نہیں نکل سکتے۔ رشتوں
کے معاملے میں وہ الف لیلیٰ کا پیرتسمہ پا ہے۔"(۲۶)

اب ضمیمہ "ب" کا انداز ملاحظہ کیجیے:

"۔۔۔میرا خیال تھا کہ تم میرا شکریہ ادا کرو گے کہ میں نے ایک روحانی کمزوری
کے بارے میں تمہیں متوجہ کیا۔ ایک ہلکا سا خوف بھی تھا کہ چونکہ تم نے گزشتہ
بیس برس میں اپنی خوشامد بے انتہا کی ہے اور تمہاری توقعات تمہارے چاہنے و
الوں نے ہی بگاڑی ہیں اس لیے میرا خط پڑھ کر ناراض ہو جاؤ گے اور مجھے
گالیاں دو گے۔ یہ گمان نہ تھا کہ چپ ہو جاؤ گے۔"(۲۷)

ضمیمہ "ج" کا انداز تحریر دیکھیے:

"میں نے زندگی میں سب سے پہلا خاکہ ۱۹۴۶ء میں لکھا تب میں اب سے
بھی کم باشعور تھا اور ممتاز مفتی ابھی پاؤں دھرنے کے لیے زمین ڈھونڈ رہا تھا۔
میری اس سے ملاقات گوردا س پور میں ڈاکٹر اشفاق حسین کے گھر ہوئی تھی جس
کا وہ پڑوسی تھا۔ ممتاز کی محبوبہ بیوی مر چکی تھی اور وہ اپنے بیٹے عکسی مفتی کے
پوتڑے دھوتا تھا۔ ڈاکٹر اشفاق حسین رنگیلا راجا تھا۔ اس کے گھر میں ہر شام
گانے کی محفل ہوتی تھی۔ طبلہ بجتا تھا اور راگ کی تانیں اڑتی تھیں۔ زندگی بہت
خوبصورت تھی۔ ممتاز مفتی تنہائی کا مارا ہوا اس کے گھر آنے لگا تھا۔ وہ طبلہ سیکھنا
چاہتا تھا۔"(۲۸)

تینوں ضمائم انھوں نے ممتاز مفتی کی زندگی میں لکھے تھے اور 'آخری حاشیہ' ان کی وفات کے
بعد لکھا اور اب تیسرا اور آخری حصہ ملاحظہ کریں

"اس نے زندگی میں ہر شخص کو تعمیر کرنے کی کوشش کی۔ اس نے لوگوں کو نئے

روپے دیئے۔ آج سے اکاون برس قبل جب میں اسے گورداسپور میں ملا تو میں
ایک نالہ خام تھا۔ میرے ذہن پر طرح طرح کے دباؤ تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو
جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ ایک دن میں نے اس سے اپنی داخلی کیفیت بیان
کی۔ اس نے نہایت توجہ سے میری داستان سنی پھر اچانک راستہ چلتے رک کر
کہا۔'' سو وٹ ! یعنی تمھیں یہاں سے بھی زخم لگے گا، وہاں سے بھی خون بہے تو
پھر کیا ہو جائے گا؟ ۔ اس'' سو وٹ'' نے مجھے ایک نیا اور جاندار رویہ دے دیا۔
اسی سو وٹ کے سہارے میں نے ساری زندگی گزار دی۔ میں کسی مہم سے نہیں
ڈرا۔ کسی بھوت کے آگے میری ٹانگیں نہیں کانپیں۔ جب بھی میں نے کسی شیر
کے منہ میں ہاتھ ڈالا، میں نے کہا۔ سو وٹ؟''(۲۹)

آخری حاشیہ کی آخری سطور میں اداسی اور جدائی کا ملال بے پایاں ہو جاتا ہے۔

''الوداع ممتاز مفتی۔۔ میں نے تمھارے ساتھ اکاون بھرپور سال گزارے۔ اس
طویل عرصے میں تم نے ایک دن بھی مجھے فراموش نہیں کیا۔ ہم دونوں نے اور
ڈاکٹر اشفاق حسین نے، جو ہمارا تیسرا مسکیٹر Musketeer تھا، کیا کیا نہیں
دیکھا۔ الوداع میرے پیارے دوست میرے غمگسار۔ مڑ مڑ کے نہ دیکھ جانی! جا
اور سیج پر سو جا۔ یعنی رات بہت تھے جاگے۔''(۳۰)

سرسراٹ (خواجہ خورشید انور)

برصغیر کے معروف موسیقار خواجہ خورشید انور کے خاکے سرسراٹ کو پڑھ کر وہ لوگ جو خواجہ صاحب کو
جانتے تھے یا ان سے یاد اللہ تھی شاید وہ بھی کہہ اٹھیں کہ خواجہ صاحب کے بارے میں فلاں بات تو وہ جانتا
ہی نہیں تھا۔ خواجہ خورشید انور کے خاکے میں لکھتے ہیں۔

''وہ کلاسیکی موسیقی سے اچھی طرح واقف تھے۔ خاں صاحب توکل حسین خاں
کی شاگردی انھوں نے برسوں کی تھی مگر جب وہ دھن بناتے تو کلاسیکی موسیقی کو
نوک دھنوں میں تبدیل کر دیتے اور سننے والے کو کبھی پتہ نہ چلتا کہ خواجہ صاحب
مجھے کلاسیکی موسیقی سنوار رہے ہیں۔ وہ دھنوں کی غنائیت کی بنیاد دکھ پر رکھتے
تھے۔ دکھ جو آنکھوں سے آنسو نہ نکلوائے مگر دل کو چھید جائے۔ انکی تانوں کا

رنگ عجیب ہوتا تھا۔مینڈھ کی تانوں سے وہ چیخیں نکلواتے تھے ۔وہ موڈ کے
بادشاہ تھے اور ان کی موسیقی موڈ کی موسیقی ہوتی تھی ۔وہ اپنے سننے والوں کو پائڈ
پائپر کی طرح پیچھے لگا کر گہرے سمندروں کی طرف چل پڑتے تھے۔بچپن انھوں
نے شملہ کے پہاڑوں میں گذارا تھا اور لوگ کہتے ہیں کہ ان کی دھنوں میں شملہ
کی لوک موسیقی کا رنگ بھی تھا مگر شملے کا کوئی لوک گانا ایسا نہ ہوا جیسا خورشید انور
نے بنایا۔ پہاڑی انھیں بہت پسند تھی مگر نہ اس میں جموں کا رنگ تھا نہ پنڈی کا۔
خواجہ کی پہاڑی ایسی پہاڑی تھی جو انھوں نے اپنے لیے خود بنائی تھی وہ سرسراٹ
تھے اور سروں سے کھیلتے تھے۔(۳۱)

خواجہ خورشید انور پر ان کی اس تحریر سے پتا چلتا ہے کہ خاکہ نگار کو نہ صرف اپنے ممدوح سے
علاقہ ہے بلکہ وہ موسیقی کے بارے میں بھی سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔وہ خاکہ لکھنے سے پہلے اپنے ممدوح
کے بارے میں بہت کچھ جان کر معلومات کو چھان پھٹک کر اس پر قلم اٹھاتے اور اس کی زندگی کے مختلف
پہلو قاری پر آشکار کرتے تھے۔خواجہ خورشید انور کی زندگی کا ایک اہم واقعہ رقم کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''خواجہ صاحب اپنے شباب کے زمانے میں انقلابی بھی رہے ہیں اور یہ بات
بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کیونکہ اپنے اس دور کے بارے میں وہ کم ہی بات
کرتے تھے۔جس زمانے میں بھگت سنگھ کا گروہ لاہور میں بم بنانے کی کوشش
کر رہا تھا خواجہ کالج میں پڑھتے تھے اور بعض کیمیائی اجزاء جو بازار میں دستیاب
نہیں تھے وہ کالج کی لیبارٹری سے اڑا کر انقلابیوں کو دیا کرتے تھے ۔ بالآخر
بھگت سنگھ کے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ خواجہ صاحب بھی پکڑے گئے مگر ان کا
ایک عزیز رشتے میں ان کا بزرگ تھا۔ایک بہت بڑا افسر تھا۔اس نے خواجہ
صاحب کو اس وعدے پر چھڑوایا کہ میں آئندہ کبھی سیاسی کام نہیں کروں گا۔پھر
خواجہ صاحب نے اپنی انقلابی طبیعت کو موسیقی کی طرف پھیر دیا اور اس میں ایسی
اپج دکھائی کہ ان کے پیچھے چلنا بھی دشوار ہے'' (۳۲)

اس خاکے میں انھوں نے خواجہ صاحب کے فن کے بارے ہی میں نہیں بلکہ ان کی شخصیت
اور ان کے احوال کے بارے میں بھی قاری کو جامع اور مصدقہ معلومات فراہم کی ہیں۔اور بتایا ہے کہ
انھیں اپنی ڈائریکشن پر ناز تھا مگر وہ اوسط درجے کے ہدایتکار تھے۔اس کے علاوہ انھیں اپنے پرانے

سٹاف کے ساتھ کام کر کے خوشی ہوتی تھی۔ وہ اپنی موسیقی کی ریکارڈنگ پر خاص توجہ دیتے تھے۔ تکنیکی حوالے سے انھوں نے خواجہ خورشید انور کی موسیقی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے کہ کلارینٹ کے جادو سے جس طرح خواجہ صاحب واقف تھے اور کوئی نہ ہوگا۔ خواجہ صاحب کے فن کے جوہر اترتے ہوئے سروں میں دکھاتے تھے۔ یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن سے کوئی ماہر موسیقی انکار نہیں کر سکتا۔ خواجہ خورشید انور کے فنی نقاد اس سے اتفاق کرتے ہیں۔ ایک اچھے خاکہ نگار کا یہی کمال ہوتا ہے کہ صاحب مذکور کی باطنی کیفیات، نفسیات اور ظاہری تصویر کھینچ کر رکھ دے۔ احمد بشیر کا یہ فن ہمیں دیگر خاکوں کی طرح یہاں بھی جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اقتباس دیکھیے:

> '' کلارینٹ کے جادو سے جس طرح خواجہ صاحب واقف تھے اور کوئی نہ ہو گا۔ جب وہ اسے منڈھر سپتک میں ترتیب دیتے ہیں تو دل سے خون بہنے لگتا ہے۔ خواجہ صاحب اپنا کمال فن اترتے ہوئے سروں میں دکھاتے تھے اور یہیں ان کی مینڈھ دل کے ٹکڑے کرتی تھی۔ مینڈھ، دوسرے گویے اور کمپوزر بھی استعمال کرتے ہیں مگر خواجہ صاحب مینڈھ نکالتے تھے تو لگتا تھا یہ ان کی ایجاد ہے۔ خواجہ خورشید انور کی موت سے کلارینٹ کوے میں چلا گیا۔ سارنگی بیٹھی روتی ہے اس کا وہ تار ٹوٹ گیا جو خورشید انور کا تار تھا۔ (۳۳)

پیرومرشد (قدرت اللہ شہاب)

احمد بشیر نے اپنی آخری سرکاری ملازمت کے زمانے میں قدرت اللہ شہاب کے تحت بھی کام کیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ان کی شہاب سے یاد اللہ تھی۔ ممتاز مفتی کی، شہاب سے قلبی قربت اور دیگر صحبت نشینوں، ابن انشاء، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، جن کا ذکر قدرت اللہ شہاب نے اقبال جرم (مشمولہ۔ شہاب نامہ) میں کیا ہے۔ ان سب سے احمد بشیر کی بھی دوستی تھی۔ یہی باعث ہے کہ انھوں نے شہاب کا خاکہ بڑا بھرپور انداز میں لکھا ہے۔ اس خاکے میں جملہ احباب کے بارے میں بھی مفصل ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر یونس جاوید نے۔ پیرومرشد۔ کو خاکوں کا خاکہ قرار دیا ہے۔ جس کی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ یہ خاکہ مختلف افراد کے ضمنی خاکوں کو ملا کر قدرت اللہ شہاب کا خاکہ بنتا ہے۔ یہاں بھی وہ اپنے '' پیرومرشد'' کے بخیے ادھیڑنے سے باز نہیں آئے۔ ان کے پیارے ہمسفر ممتاز مفتی کو قدرت اللہ شہاب کے ساتھ تعلق خاطر تھا ان کے اس اسلوب نگارش پر ان کے درمیان تعلقات میں تعطل اور ناراضی و ناگواری

کے مراحل بھی آئے۔ مگر احمد بشیر کا قلم یہاں مصلحت نگاری کا مرتکب نہ ہوا۔

قدرت اللہ شہاب کے خاکے میں بدلتے ہوئے انداز نگارش کو دیکھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے انھوں نے '' شہاب نامہ'' پر لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تھا۔ جیسا کہ اس خاکے میں شہاب نامے کے حوالے سے بعض احوال نقل ہیں۔ اور شہاب نامے ہی کے بعض واقعات کو انھوں نے شہاب کی شخصیت کو شناخت اور پرداخت کے لیے استعمال کیا ہے۔ مگر شہاب سے تعلق خاطر اور طویل شناسائی اور رفاقت کے باعث بار باران کی تحریر میں شہاب کی شخصیت مداخلت کرنے لگی۔ احمد بشیر نے مذکورہ خاکے میں اسی بات کا اظہار بھی بجا طور پر کیا ہے۔ کہتے ہیں۔'' ۔مگر میں تو شہاب نامہ پر مضمون لکھنے چلا تھا۔ یہ قدرت اللہ شہاب بیچ میں کہاں سے ٹپک پڑا۔'' بہرحال اس خاکے میں انھوں نے اپنے اس تعلق کو کام میں لاکر شہاب کی شخصیت کو کھنگال کرا جالا ہے۔ اس میں ان کی روایتی بے باکی اور بے لاگی اپنے جوبن پر ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ کریں:۔

> '' شہاب ایک مجموعۂ اضداد شخص تھا۔ بیک وقت کمزور اور طاقتور۔ ذرا خیال کرو کہ شہاب جیسا معمولی قد و قامت کا شخص جس پر راہ چلتے کوئی شخص دوسری نظر بھی ڈالنی ضروری نہ سمجھے بچپن میں ایک منہ زور بنئے کو چڑانے کے خیال سے زور زور سے درود شریف کی تلاوت کرتا ہے اور اسی مستی میں روزانہ بائیس میل کا پیدل سفر کر لیتا ہے۔ بڑا ہوتا ہے تو ایمن آباد کی چندراوتی کے عشق میں گرفتار ہوتا ہے اور روزانہ بائیسکل پر ستر میل آتا جاتا ہے مگر لڑکی کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ کیا اس سے بڑی بہادری کہیں ممکن ہے؟'' (۳۴)

آگے چل کر' مجموعۂ اضداد' کی مزید مثالیں دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

> '' شہاب دنیاداری کے بھید خوب جانتا تھا اور جب ضروری سمجھتا تھا تو جھوٹ بھی بول دیتا تھا۔ اس کے جھوٹ یا تو دفتری کاموں سے متعلق ہوتے تھے یا کسی کی دل جوئی کی خاطر۔ کسی کو دھوکا دینے یا کوئی فائدہ اٹھانے کے لیے اس نے جھوٹ نہیں بولا۔ جھوٹ بول کر وہ کسی فضول ذمہ داری سے بھی بچنا چاہتا تھا۔ وہ کبھی کبھی ایسے سرکاری کاغذ بھی چھپا لیتا تھا جن سے افسروں کو ظلم کرنے کا جواز ملے۔ ایسے موقعوں پر وہ ایسے گول مول نوٹ لکھتا تھا۔ جن کے دو دو تین تین معنی ہوں۔ وہ اپنی تکمیل ذات کے راز بھی نہایت دیدہ دلیری سے چھپاتا تھا۔'' (۳۵)

''شہاب عام طور پر مصیبت زدہ لوگوں کی زندگیوں میں مداخلت کرنے سے اجتناب کرتا تھا۔ کیونکہ پھر اسپر ان کی امداد کرنے کی ذمہ داری آن پڑتی تھی۔ایک اس کا یہ فلسفہ بھی تھا کہ مصیبت زدہ آدمی تقدیر کے کسی امتحان میں سے گزر رہا ہے۔اس کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے۔مگر وہ اپنے قریبی دوستوں کی امداد سو قانون توڑ کر بھی کرتا تھا اور اس سلسلے میں جائز ناجائز کی پروا بالکل نہ کرتا تھا۔اس کے خیال میں نوکری اور روزگار میں جائز اور ناجائز کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔(۳۶)

شہاب شناسی کے لیے، دوران ملازمت شہاب کی ماتحتی کی روداد سے بھی بعض انہی واقعات کا ذکر کیا ہے جو ناول، دل بھٹکے گا میں بھی موجود ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے شہاب سے اپنی آخری ملاقات اور بعض ان باتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو شہاب نامہ میں (شاید فساد خلق یا فشار فکر کے اندیشے کے باعث) مذکور نہیں۔شہاب سے آخری ملاقات کے بارے میں انھوں نے ''پیر و مرشد'' میں ایک سے زائد مرتبہ ذکر کیا ہے۔شہاب نامہ میں اقبال جرم میں قدرت اللہ شہاب نے اپنے اس احساس جرم کا ذکر اور اقبال نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس میں اقبال جرم کم اور تفاخر اور بریت کا میلان غالب ہے۔جبکہ احمد بشیر کے ساتھ ان کی آخری ملاقات میں اقبال جرم اپنی روح کے ساتھ موجود ہے۔ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''قوم ذلت کی جس انتہا کو پہنچ چکی ہے اس کی کچھ ذمہ داری ذاتی طور پر مجھ پر بھی آتی ہے۔میں نے ایوب خاں کی خدمت اپنی سرکاری ڈیوٹی سے بہت آگے بڑھ کر انجام دی۔میں نے اسے اس کی پسند کے مشورے دیئے۔اور اسکے بعض فیصلوں میں شریک بھی رہا۔جن کی بدولت ڈکٹیٹر شپ جڑ پکڑ گئی اور قوم کا ہر فرد ذلیل و خوار ہوا۔۔اخلاق تبدیل ہو گئے۔اقدار بگڑ گئیں۔۔۔۔اس رذالت میں میرا جو حصہ ہے میں اس کی وجہ سے سخت ندامت میں مبتلا ہوں۔مگر اب کچھ ہو نہیں سکتا۔'اس نے اپنا کلیجہ ایک ہی سانس میں الٹ دیا۔حالانکہ وہ سیدھی سادی بات بھی رک رک کر ٹکڑوں میں بیان کرنے کا عادی تھا۔۔ایسا پکا ہوا میں نے پہلے اسے کبھی نہ دیکھا تھا۔وہ عام لوگوں سے محبت کرتا تھا مگر یہ احساس مجھے پہلے نہ ہوا کہ عوام کی عزت نفس کے ذبیحے پر اسے چھری سے کوئی شکایت ہے۔۔''(۳۷)

شہاب کا احمد بشیر کو انتخاب کرنا ان کی مردم شناسی اور احمد بشیر سے ان کے تعلقات کی نوعیت پر دال ہے۔انھیں اس بات کا بخوبی یقین تھا کہ احمد بشیر ہی وہ آدمی ہے جس کے سامنے وہ اپنا پچھتاوا بیان کر کے اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر سکتے ہیں۔''پیر و مرشد'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے صفدر میر نے بھی احمد بشیر اور شہاب کے درمیان اعتماد کی اسی فضا کو واضح کیا ہے:

"This confession of QU Shahab is a unique piece of evidence of the self-incrimination of a super bureaucrat of Pakistan.The Shahab s' ›uld have made this cnfession to Ahmed Bashir is a reflection on the nature of relationship between the two, and the manner in which shab valued the frankness and political uprightness of Ahmed Bashir -". (38)

پچھلی سطور میں ان کی خاکہ نگاری کا ایک وصف یہ بھی مذکور کیا گیا تھا کہ ان کے خاکے میں کئی اور لوگوں سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔''پیر و مرشد'' اس خیال کی بہترین مثال ہے۔اس میں بقول احمد بشیر ''شہاب کی مجلس کے مست'' ابن انشاء۔جمیل الدین عالی۔اشفاق احمد۔ممتاز مفتی۔اور بانو قدسیہ بھی جلوہ گر ہیں (۳۹)۔پیر و مرشد میں ان ہستیوں کے بھی خدوخال واضح کیے گئے ہیں۔نیز ان کے بارے میں،ان کے کردار کے بارے میں احمد بشیر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔قدرت اللہ شہاب کے ان کے ساتھ معاملات اور تعلقات اور سلوک کے حوالے سے بھی روشنی ڈالی ہے۔اس خاکے کو شہاب صاحب پر لکھی گئی تحریروں میں اعتبار حاصل ہے۔اس خاکے میں بھی ان کا انداز وہی ہے۔خاکہ،ان کے دیگر خاکوں کی طرح طویل اور مفصل ہے۔مگر اس میں مذکورہ بالا ہستیوں کا ذکر از کار اس قدر مفصل ہے کہ بعض جگہ خاکے کی وحدت تاثر مجروح ہوتی محسوس ہوتی ہے۔مگر قطع نظر اس صفت کے شہاب کی کردار نگاری اور واقعیت کے اعتبار سے یہ خاکہ شہاب کی شخصیت کے مطالعے میں بہت اہمیت کا حاصل ہے۔

مجاہد (پروفیسر وارث میر)

پروفیسر وارث میر،شعبہ ابلاغیات میں کہنہ مشق استاد تھے۔روزنامہ جنگ میں مسلسل کالم لکھا کرتے تھے۔یونیورسٹی میں ایک (مذہبی) طلبہ تنظیم کے ہاتھوں انہیں جو تکالیف اٹھانا پڑیں اور جس طرح وہ اپنے

آدرشوں پر ڈٹے رہے۔اسی طرح اخبار کے صفحات پر جس طرح ان کا قلم مارشل لاء کے خلاف لکھتا رہا۔اس پر احمد بشیر نے انہیں بعد از مرگ اس مضمون میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ وہ ایک معصوم خاندان کا سربراہ تھا۔اس نے اپنے چار بچوں (۴۰) کو دیانتداری اور سچائی سے زندگی بسر کرنا سکھایا تھا۔اس کی بیوی اور ایک ہی بچی صبر و استقلال کی دولت سے مالا مال تھیں۔خود وہ اگلے وقتوں کا مجاہد تھا۔وہ عالمی اور ابدی حقیقتوں کے لیے لڑتا تھا۔وہ پاکستان پر جان چھڑکتا تھا۔اسلام کے انقلابی پہلو کا ترجمان تھا۔مساوات پر یقین رکھتا تھا۔(۴۱)

دراصل احمد بشیر جس طرح خود دبنگ تھے انہیں اپنے قبیل کے لوگوں سے مل کر خوشی ہوتی تھی۔انھوں نے جہاں منافقوں اور بزدلوں اور بے ایمانوں کو اپنے قلم سے کچوکے دیئے اسی طرح وہ سچے، دلیر اور قلمی دیانتداروں کی تعریف و تحسین میں بھی فراخ دل تھے۔اس خاکے میں انھوں نے وارث میر کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔

> ''وارث میر ایک انتہائی ایماندار اور مخلص دانشور تھا۔موت سے پانچ سال قبل تک وہ ایک قدامت پسند مسلمان تھا جو رکی مذہب پر یقین رکھتا ہے۔وہ جدیدیت کے خلاف تھا۔ظواہر پر ایمان رکھتا تھا۔نئے رجحانات پر شک کرتا تھا۔ترقی پسندی کو اسلام دشمنی سمجھتا تھا۔کیمونسٹوں کی جان کا دشمن تھا۔امریکہ کے افغان جہاد کا حامی تھا۔'' (۴۲)

وارث میر کے بارے میں بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ دائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے مگر انھوں نے مارشل لائی جہاد افغانستان کے خلاف اور فوجی آمریت کے خلاف لکھنے کی پاداش میں ہر دباؤ کا مقابلہ کیا۔آگے چل کر وارث میر کے فکری ارتقا اور اس کا یا کلپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> بحث مباحثے میں کبھی ایسی بات آجاتی جس کا جواب اس کا قدامت پسند شعور نہ دے سکتا تو وہ ضد میں آکر اڑ جانے کی بجائے خاموش ہو جاتا۔اس کے ماتھے پر تفکر کی شکنیں پڑ جاتیں اور وہ فریق مخالف کی بات پر غور کرنے لگ جاتا۔میرے ساتھ اس کے بہت دنگل ہوئے۔۔۔وارث میر نے اچانک اپنے آپ کو تبدیل کر لیا اور کسی معذرت کے بغیر اسنے اپنے پرانے خیالات کو تج دیا۔وہ نئے خیالات کا اظہار کرنے لگا۔وہ ایک اچھا مقرر بھی تھا۔تحریر کے ساتھ ساتھ تقریر میں بھی وہ آمریت پر فتوے فروشی پر اور منافقت پر موسلا دھار برسنے لگا۔یہ بات

ریاستی اکابرین کے لئے حیرت ناک تھی۔اب تک وہ وارث میر کو استعمال کرتے
رہے تھے۔اب وہ ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔(۴۳)

ایک نیم سیاسی طلبہ تنظیم نے اس پر ان کا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔اس خاکے میں اس سلوک کی افسوسناک اور کرب انگیز جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ان کے خلاف جس شعبے میں وہ پڑھاتے تھے وہاں ان کے خلاف ایک محاذ کھول رکھا تھا۔ان کے دفتر پر چڑھ دوڑے۔وہ یونیورسٹی ہاسٹل کے وارڈن تھے سو وہیں اپنے اہل وعیال کے ساتھ مقیم تھے۔اس تنظیم کے کارندے آتے جاتے،ان کے گھر پر زور زور سے آوازیں لگاتے گالیاں دیتے تھے مگر وہ ثابت قدم رہے۔اس بارے میں انھوں نے ایک واقعہ بیان کیا ہے جو وارث میر کی بطور استاد عالی ظرفی،حکمت اور ردعمل کی ایک نظیر ہے:

''ایک روز وہ اپنی بچی کے ساتھ گھر کے قریب ٹہل رہا تھا کہ نوجوان طالب علموں کا ایک ٹولہ ادھر گزرا۔ایک نے اسکی بچی کو دیکھ کر کہا''ٹوٹا اچھا ہے''۔ وارث میر وہیں رک گیا۔جب وہ ٹولہ واپس لوٹا تو اس نے لڑکوں سے کہا میرا گھر قریب ہی ہے کیوں نہیں تم میرے ساتھ چل کر چائے کا ایک پیالہ پیتے۔لڑکوں کو ساتھ لے کر وہ گھر پہنچا۔انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔پھر اپنی بیوی کو بلایا اور ان سے کہا''یہ اس ٹوٹے کی ماں ہے'اس کو ان پر غصہ نہیں آیا تھا۔اسے پتا تھا کہ میری مخالفت ذاتی نہیں فکری اور منظم ہے۔وہ ٹلنے والی چیز نہیں تھا۔۔جیسے جیسے اس کی مخالفت بڑھتی گئی اس کا قلم تیز ہوتا گیا۔''(۴۴)

دراصل وارث میر ایک دردمند اور انقلابی انسان تھے۔ان میں بات کی سچائی تسلیم کرنے کا مادہ تھا۔وہ کٹھور اور ہٹ دھرم نہیں تھے۔اسی لیے احمد بشیر سے ان کے مباحث انھیں بقول احمد بشیر اس نہج پر لے آئے تھے۔بعض بائیں بازو کے لوگوں کا خیال تھا کہ وارث میر نے پینترا بدلا ہے تو کسی مار پر ہوگا۔ اسی سوچ کے تحت انھیں بائیں بازو کے ایک کارکن نے جس کی اپنی موقعہ پرستی چھپائے نہ چھپتی تھی،مراسلہ لکھا جس میں دشنام طرازی کے ساتھ ان پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت بائیں بازو میں گھسے ہیں۔وارث میر یہ جان کر بہت آزردہ ہوئے تو احمد بشیر نے کہا:

''وارث میر تم نہیں جانتے کہ یہ شخص کچھ بھی نہیں ہے تم جی ہلکا نہ کرو۔اس وقت تو لاہور میں تم ہی تم ہو،اور یہ بات سچ تھی تھوڑے دنوں کے بعد جب اس کا جنازہ اٹھا تو وہ لاہور میں فیض کے بعد سب سے بڑا جنازہ تھا۔اس میں اس کے

دشمن بھی کندھا دینے آئے تھے کیونکہ وہ بھی وارث میر کے باطن کی صفائی، حق گوئی اور جرأت سے مرعوب تھے۔۔اسلام ایک انقلابی سے، قلم ایک مجاہد سے اور پاکستان ایک سچے پاکستانی سے محروم ہوگیا۔ جب وہ گیا تو اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ سوائے ایک قلم کے جس کی کاٹ سے خنجر پناہ مانگے۔'' (۴۵)

راستے کا کنکر (میجر اسحاق محمد)

میجر اسحاق محمد کو لوگ پنڈی سازش کیس کے حوالے سے جانتے ہیں۔ انھوں نے اس خاکے میں جو کہ ان کی وفات کے بعد انہیں خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اور ان کے اوصاف پنہاں سے قاری کو روشناس کروانے کے لیے لکھا۔ اس میں ان کی شخصیت کا مکمل احاطہ کیا ہے۔ اپنے ممدوح کی شخصیت کی دروبنی کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس عہد اور میجر اسحاق کی انقلابی جدوجہد اور کردار کے حوالے سے ترقی پسندوں کی پیش رفت کا بھی احاطہ کیا ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

'' میجر اسحاق محمد کا انقلاب کا تصور مشینی اور آٹو میٹک نہیں تھا۔ وہ تاریخ کے سفر میں مارکسی اصولوں پر مبنی ایک خالص پاکستانی انقلاب کا خواب دیکھتا تھا۔ اسے پاکستان کے معروضی حالات کا بھی علم تھا۔ چنانچہ قید سے چھوٹ کر وہ کمیونسٹ پارٹی میں شامل نہ ہوا۔۔۔ میجر اسحاق موجودہ نظام کا دشمن تھا۔ وہ کوئی چھے مرتبہ جیل گیا مگر اس پر کبھی فرد جرم ثابت نہیں ہوئی۔ جب اسے فالج نے جکڑ لیا تو اس وقت بھی وہ فیصل آباد جیل میں قید تھا۔ اسے کسی جرم کی پاداش میں نہیں بلکہ محض ایک خطرناک آدمی کے طور پر حراست میں لیا گیا تھا۔'' (۴۶)

پاکستان کی تاریخ میں ایسے بہت سے لوگ ہیں۔۔ بہت سے گمنام سپاہی ہیں۔۔ جنہوں نے وطن عزیز کی جبیں روشن کرنے کے لیے اپنے لہو سے چراغ روشن کئے۔ مگر تاریخ پاکستان کے صفحات ان کے بارے میں خاموش ہیں۔ کہ یہ تاریخ استعمار کی پروردہ اور سامراج کی حمایت یافتہ حکومتوں کی لکھوائی ہوئی ہیں۔ احمد بشیر نے اپنے قاری کو ایسے لوگوں سے روشناس کروا کر بطور اہل قلم اپنا قرض ادا کیا ہے۔ انھوں نے اس گمنام سپاہی کو راستے کا کنکر قرار دینے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

'' میجر اسحاق غالباً ایک ہی انقلابی تھا جو خالص پاکستانی پیداوار تھا۔ اس نے بہت کچھ کیا اگر چہ اس نے کوئی ٹھوس کامیابی حاصل نہیں کی۔ مگر وہ آنے والے

چھپن چھری (کشور ناہید)

ان کا کشور ناہید پر لکھا ہوا خاکہ نہ صرف اپنے عنوان بلکہ نفسِ مضمون کے اعتبار سے بھی اردو خاکہ نگاری کا انوکھا واقعہ ہے۔ حقائق کا بیان اپنی زمانی اور مکانی موزونیت اور غیر موزونیت کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس میں ذرا سی عدم احتیاط اور بعض الفاظ کے (لغت کے برعکس) رائج معانی کو نظر انداز کرنے سے بھی نزاعی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور تحریر پر مبتذل ہونے کا الزام آ جاتا ہے۔ کشور ناہید کے خاکے میں ان دونوں اصولوں سے صرف نظر کیا گیا ہے۔ یونس جاوید نے اس خاکے کا عنوان بدل کر "چھپن چھری" (۴۸) رکھ دیا بلکہ وہ جملے بھی حذف کر دیے جس میں عنوان کا حوالہ بنتا تھا (۴۹) اور یوسف کامران کی تائید کا بھی ذکر تھا۔

خاکے کی مقبولیت کے بارے میں اور کشور کے انداز نظر اور عالی ظرفی کے بارے میں معصوم احمد بشیر کے الفاظ ملاحظہ کریں:

> بعض اخبارات میں معتبر خواتین کے بیانات بھی چھپے۔ حالانکہ انھوں نے مضمون سنا نہ تھا۔ اس لحاظ سے یہ خاکہ بہت ہٹ ہوا۔ کشور ناہید مجھ سے بگڑ گئی۔ اس نے مجھ سے بول چال چھوڑ دی مگر میں جانتا تھا کہ وہ دل سے ناراض نہیں۔ کیونکہ میں نے خاکے میں کوئی ایسی بات نہ لکھی تھی جس پر وہ ناراض ہو۔ دو برس وہ مجھ سے بظاہر ناراض رہی۔ دو برس کے بعد اس نے مجھے ٹیلی فون پر کہا' چلو چھوڑو اب جانے دو۔ میں نے بھی بات چھوڑی۔" (۵۰)

ان کا کہنا ہے کہ کشور کا خاکہ لکھنے یعنی اس کی شخصیت کے خدوخال واضح کرنے کے لیے بے تکلفی ضروری تھی۔ انھوں نے کشور کے بارے میں جو کہا اس کا استناد خود کشور کی خودنوشت "ایک بری عورت کی کتھا" کے مندرجات اور مواد سے بھی ملتا ہے۔

فری لانسر (عبدالمجید بھٹی)

یہ خاکہ بھی خراج تحسین ہے، یاد نگاری ہے۔عبدالمجید بھٹی۔۔ جو پاکستان کا پہلا فری لانسر ادیب تھا۔ پہلے کاتب تھا۔ پھر ایک فری لانسر بنا۔۔جس نے پنجابی میں ناول ''ٹھیڈا'' لکھا جب نہ چھپا تو اس نے اسے ٹھوکر کے نام سے اردو میں لکھنا شروع کر دیا۔ وہ جو اپنی تخلیقات اخبار، رسائل اور ریڈیو پر بیچ کر نہایت توکل سے اپنی گزر اوقات کرتا تھا۔ اس کا رہن سہن بڑا انوکھا تھا۔ احمد بشیر نے موصوف کا خاکہ اس خوبصورتی سے کھینچا ہے کہ قاری جوں جوں پڑھتا آگے بڑھتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں صاحب خاکہ کا سراپا لہرانے لگتا ہے۔ انداز ملاحظہ کریں۔ آغاز یوں ہوتا ہے:

> ''عبدالمجید بھٹی کا آخری وقت آیا تو وہ یوں گیا جیسے پھول سے خوشبو جائے۔ اسے دل کا عارضہ تھا مگر اس نے کبھی اس کی پروا نہ کی تھا۔ زندگی کو اس نے بھرپور طریقے سے استعمال کیا۔ جینے کے شوق نے اسے موت کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہ دی تھی۔ وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک اٹھ کر کھٹولی پر گر گیا اور اپنے بڑے بیٹے کو بلایا۔ مقبول۔۔ مقبول بھاگتا ہوا آیا تو بھٹی نے کہا' لے بھئی مقبول اللہ بیلی!' اس نے دوسرا سانس نہ لیا۔ زمین سے اپنی گٹھری اٹھا کر گوگیڑا ان دیکھے دیس کو چل دیا۔(۵۱)

> ''بھٹی کا سیاسی گیان کوئی ایسا پختہ نہ تھا۔۔ معاشرے کی تبدیلی کے بارے میں اس کا علم واجبی کہا جا سکتا تھا۔ مگر وہ خودمحبت کش طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ زندگی اس نے ایک جوگی، ایک آوارہ گرد، خزاں میں اڑتے ایک زرد پتے کی طرح گزاری تھی۔ اس لیے اسکو پتہ تھا کہ دشمن کون ہے۔ اور اسی حوالے سے وہ نظم اور نثر لکھتا تھا۔''(۵۲)

عرب ہوٹل میں جہاں ادیبوں اور شاعروں کی بیٹھک ہوا کرتی تھی۔ وہاں پر اکثر بھٹی کی کارستانیوں کے احمد بشیر بھی شاہد تھے۔ مگر انھوں نے دیگر لوگوں کی طرح اسے کبھی استہزائیہ انداز سے نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ ان کی تحریر جس طرح ان کی شخصیت کا احاطہ کرتی محسوس ہوتی ہے کہ وہ اس کی حرکات وسکنات کے ایک سنجیدہ شاہد اور تجزیہ کار تھے۔ جب احمد بشیر ہفت روزہ قندیل کے مدیر ہوئے تو انھوں نے اس کے پنجابی کلام کو چھاپا۔ اس خاکے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس میں احمد بشیر کا انداز ان کے دیگر خاکوں سے جدا ہے۔ یہاں انھوں نے ایک کہنہ مشق خاکہ نگار کی طرح عبدالمجید بھٹی کی شخصیت کے

خدوخال واضح کئے ہیں۔ یہاں ان کے قلم کی آنچ بھی دھیمی ہے۔انھوں نے کسی فکر وفلسفہ کے بجائے اپنی کاوش اپنے ممدوح کی شخصیت کے خدوخال اجالنے تک محدود رکھی ہے۔

موچھا (بریگیڈئر عاطف)

احمد بشیر کی تحریریں پڑھ کر اگر قاری یا نقاد بھی حق گوئی سے کام لے تو برملا کہہ اٹھے کہ ''احمد بشیر بلا کا'' حق نگار'' ہے۔ یہ بات پہلے بھی بیان میں آ چکی ہے کہ وہ کسی بھی شخصیت کا مطالعہ کرتے وقت اس کا تجزیہ کرتا ہے۔ تجزیہ چیزوں کو اجزائی شکل میں دیکھنے کا عمل ہے۔ وہ بھی جب کسی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو اسے اس کی شخصیت کو اجزاء میں تقسیم کر کے اس کے اوصاف کا ایک ماہر نفسیات کی طرح مطالعہ کرتے ہیں اور پھر اپنے تأثر کو کسی معصوم بچے کی طرح بغیر کسی لگی لپٹی کے بیان کر دیتے ہیں۔ وہ ایک ایسا مصور ہے جو کسی شخصیت کی خامیوں اور خوبیوں کے ٹکڑے جوڑ کر ایک مونتاج بنا کر اپنے ناظر (قاری) کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔''موچھا'' میں ملاحظہ کیجئے اپنے بہنوئی بریگیڈیئر عاطف کی شخصیت کشی میں ان کا یہی ہنر کارفرما نظر آتا ہے۔

> ''وہ بہت بے رحم اور بے حس ہے۔ وہ جوان عورتوں کو پسند کرتا ہے مگر ان کا حسین ہونا ضروری نہیں۔۔۔اس کے بہت دشمن ہیں مگر اس کے کسی بدترین دشمن نے بھی اس پر خیانت کا الزام نہیں لگایا۔۔۔ دونوں میاں بیوی جب کسی انٹرنیشنل ٹورنامنٹ میں بطور مہمان یا مبصر بلائے جاتے ہیں تو الگ الگ کمروں میں سوتے ہیں۔۔۔ وہ ایک طاقتور، خود پسند، پراعتماد اور اکیلا شخص ہے۔۔ وہ غالباً واحد شخص ہے جسے جنرل ضیاء الحق نے بھی مارا اور بے نظیر بھٹو نے بھی مارا۔ عاطف کا مزاج کھلاڑی کا ہے۔ جبلت مزدور کی سی، احساسات مشین کے سے اور پلاننگ کمپیوٹر کی سی۔ وہ ایک ایسا کامیاب آدمی ہے جس کی جذباتی زندگی ایک طرف بھرپور دوسری طرف خالی ہے۔''(۵۳)

ہر چند اردو میں ہر خاکہ نگار کا اپنا ایک اسلوب ہے اور خوب ہے۔ مگر احمد بشیر کا انداز تحریر منفرد اور نرالا ہے۔ان کے اس انداز سخن سے اتفاق یا اختلاف اور اس کی تحسین وتنقیص کی گنجائش ضرور موجود ہے۔ان کے خاکوں میں سے چند ایسے جملے ملاحظہ کریں جن کے اندر بیان کئے جانے والے حقائق کا یوں برملا اظہار محل نظر ہے۔

"پروین میری بہن اس زمانے میں ایم اے میں پڑھتی تھی اور لاہور میں رہتی تھی۔ وہ ایسی حسین لڑکی تھی کہ میں اس کا بڑا بھائی ہو کر چوری چوری اس کی طرف دیکھتا اور سوچتا اللہ میاں تو نے یہ بت کسی فرصت کی گھڑی میں گھڑا ہوگا۔ یہ چاند ہمارے صحن میں کیسے اتر آیا۔ پروین کے نین کاجل بن کالے۔ اس کی کلائیاں گجروں بنا مہکتیں۔ اس کے رخساروں کے گرد بھنورے منڈلاتے۔۔۔۔ پروین کو اپنے حسن کی خوشبو کا کوئی احساس نہ تھا وہ ململ کے موٹے کپڑے پہنتی، سر پہ کھدر کی چادر لے کر بس میں بیٹھ جاتی اور اسی طرح کتابوں کا بستہ لے کر واپس آ جاتی۔ اس کے ہم جماعت اس کے پیچھے گھر تک آتے مگر اسے کبھی پتہ نہ لگا۔ وہ مس یونیورسٹی کے نام سے مشہور تھی مگر اس نے کبھی آئینہ نہ دیکھا۔۔۔"

آگے چل کر موصوف کی سال خوردہ جوانی کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں۔

"اب اس نیلے گنبد کی ساری نظمیں اکھڑ چکی ہیں۔ مگر چھتری کی گولائی پر ابھی چاندنی چھنکتی ہے۔ وہ اردو کی صاحب طرز ادیب ہے مگر بدخط ہے اس لیے کم لکھتی ہے۔ لکھتی ہے تو عاطف کے لیے جس نے اس کی کوئی تحریر کبھی نہیں پڑھی۔" (۵۴)

ان کا یہ انداز تحریر ان کی روح کی پاکیزگی اور رشتوں کی محبت کا پتہ دیتی ہے۔ مگر ہر قاری ان کا سا اجلا من کہاں رکھتا ہے اور پھر کسی بھی معاشرے میں جذبات اور کیفیات کے بیان کے کچھ اصول خود بخود وضع ہو جاتے ہیں اور ان کے بیان میں الفاظ کا استعمال بھی متعین ہو جاتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ ان کے لکھے ہوئے بعض جملے قارئین اور سامعین کی سرگوشیوں کا موضوع بھی بنے۔ اس کے علاوہ ان کے بعض خاکوں میں ان کے دیگر سیاسی مضامین اور خطوط کی طرح ماہر عمرانیات اور تاریخ عالم خاص طور پر اشتراکی حوالے سے تاریخ کا گہرا شعور جھلکتا ہے۔ دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کے بارے میں، سرمایہ دار کی مذہب کی آڑ میں شکار کھیلنے کا مکارانہ کھیل تاریخ انسانی کے تناظر میں ان کے سامنے تھا۔ وارث میر، میجر اسحٰق، بریگیڈیئر عاطف ممتاز مفتی، شہاب کے علاوہ مفتی جی کے خاکوں سے خاکہ نگار کے عقائد اور نظریہ فن کا بھی برملا اظہار ملتا ہے۔ احمد بشیر کے خاکے میں یہ خاصیت ہے کہ خاکہ پڑھتے ہوئے قاری کو خاکے کی تحریر میں صاحب خاکہ کی شخصیت اور صورت بنتی محسوس ہوتی ہے۔ خاکہ نگاری میں ان کا

ندازکسی قدر ممتاز مفتی اور اپنے استاد مولانا چراغ حسن حسرت سے ملتا جلتا ہے۔ مگر ان کے انداز تحریر میں بے باکی ممتاز مفتی اور واقعیت نگاری میں مولانا چراغ حسن حسرت کی یاد دلاتی ہے۔ البتہ ان کا لہجہ دھیما اور وضعدار ہے مگر جب احمد بشیر حقائق کا بیان شروع کرتے ہیں تو ان کے اندر سے وہ خود سراور سر پھرا صحافی ادب کر باہر آ جاتا ہے۔ ان کے الفاظ قاری کو کہیں چبھتے ہیں، کبھی کھجلی کرتے ہیں تو کبھی گدگدی کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ بہر حال سطر، ہر جملہ اور ہر لفظ، قاری کو اپنا جواز فراہم کرتا ہے۔ ان خاکوں کے غائر مطالعے کے بعد پتا چلتا ہے کہ اسلوب کے اعتبار سے ان کا خاکہ عصمت چغتائی۔ منٹو اور مفتی کے اسلوب کے قریب تر ہے۔ وہ شخصیت کے ظاہری خدوخال کے بجائے دروبینی سے کام لیتے ہوئے پیش نظر شخصیت کا نفسیاتی سطح پر بھی جائزہ لیتے ہیں۔ احمد بشیر کے خاکے طوالت اور تفصیل واقعات کو آگے بڑھانے کے لیے conveyor belt کا کام دیتی ہے۔ البتہ کہیں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنا تذکرہ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ صاحب خاکہ کی شخصیت پس منظر میں چلی جاتی ہے لیکن اس صفت کے باوجود احمد بشیر کے خاکے، اردو ادب کی اس صنف میں اپنی مثال آپ ہیں۔

حوالہ جات وتوضیحات

۱۔حرفِ آغاز ،جو ملے تھے راستے میں(خاکے) ازاحمد بشیر

۲۔جو ملے تھے راستے میں ،ازاحمد بشیر ،ص:۴۱

۳۔روز نامہ ڈان،جو ملے تھے راستے میں،پر تبصرہ بعنوان: A book of literary portraits by Gilani Kamran

۴۔جو ملے تھے راستے میں۔۔ص:۲۴،۲۵

۵۔ایضاً۔۔ص۲۳،۲۴

۶۔ایضاً۔۔ص:۱۳

۷۔ایضاً۔۔ص۱۵

۸۔ایضاً۔۔ص:۲۶

۹۔ایضاً۔۔ص۸۳

۱۰۔ایضاً۔۔ص۸۵

۱۱۔خاکے میں ڈاکٹر یونس جاوید کا نوٹ

۱۲۔جو ملے تھے راستے میں،ازاحمد بشیر،ص:۹۱

۱۳۔ایضاً۔۔ص:۹۱

۱۴۔ مقالہ''احمد بشیر حیات وادبی خدمات ،ریاض احمد ریاض

۱۵۔جو ملے تھے راستے میں،ازاحمد بشیر،ص:۱۰۴

۱۶۔ایضاً۔۔ص۱۱۴

۱۷۔ایضاً۔۔ص۱۱۴

۱۸۔ایضاً۔۔ص:۱۱۵

۱۹۔یہ خاکہ'ادبِ لطیف' کے سالنامے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا تھا۔

۲۰۔جو ملے تھے راستے میں ،ازاحمد بشیر ،صص:۱۳۰

۲۱۔ایضاً۔۔ص۱۳۱

۲۲۔ ایضاً۔۔ص۱۴۵

۲۳۔ایضاً۔۔ص۱۴۷

۲۴۔ایضاً۔۔ص۱۷۶

۲۵۔ایضاً۔۔ص۲۵۔۱۸۳

۲۶۔ایضاً۔۔ص۲۶۔۱۸۴

۲۷۔ ایضاً۔۔ص۱۸۸

۲۸۔ایضاً۔۔ص۱۹۰

۲۹۔ایضاً۔۔،ص۱۹۳

۳۰۔ایضاً۔۔ص۱۹۶

۳۱۔ ایضاً۔۔ص۲۰۰

۳۲۔ایضاً۔۔ص۲۰۴

۳۳۔ایضاً۔۔ص۲۰۳

۳۴۔ایضاً۔۔ص۲۱۲

۳۵۔ایضاً۔۔ص۲۱۷

۳۶۔ ایضاً۔۔ص۲۲۰

۳۷۔ایضاً۔۔ص۲۱۰

۳۸۔ Daily Dawn, Dated July 12, 1996, Review on Ahmed Bashir 's Jo Milay Thay Rastay Mein By Safdar Mir Zino

۳۹۔ جو ملے تھے راستے میں ،از احمد بشیر ،ص:۲۲۱

۴۰۔معروف اینکر حامد میر، وارث میر کے صاحبزادے ہیں

۴۱۔جو ملے تھے راستے میں،از احمد بشیر،ص ۲۴۱

۴۲۔ ایضاً۔۔ص۲۴۲

۴۳۔ ایضاً۔۔ص۲۴۴

۴۴۔ ایضاً۔۔ص۲۴۴

۴۵۔ ایضاً۔۔ص:۲۴۵،۲۴۷

۴۶۔ایضاً۔۔ص۲۵۴، ۲۵۵

۴۷۔ایضاً۔۔ص۲۵۶

۴۸۔چھپن چھری۔گوہر جان بائی اس صدی کے اوائل میں ایک مشہور گانے والی خاتون تھی جس کے کسی چاہنے والے نے رقابت میں جل کر اسے چھریاں ماردیں اورکل چھپن زخم لگے۔جن سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا۔پھر وہ منہ پر پردہ ڈال کر گانے لگی اور ریکارڈ گانوں کے آخر میں جب اپنا نام بولاتو کہا چھپن چھری گوہر جان۔۔بحوالہ مؤلف

۴۹۔یونس جاوید سے مصاحبہ

۵۰۔جو ملے تھے راستے میں،ازاحمد بشیر۔۔ص:۲۷۰، ۲۷۱

۵۱۔ ایضاً۔۔ص:۲۷۵

۵۲۔ ایضاً۔۔ص:۲۸۰

۵۳۔ ایضاً۔۔ص۲۹۶

۵۴۔ایضاً۔۔ص۲۸۴

بطور ناول نگار

اپنے ناول ''دل بھٹکے گا'' کے دیباچے کے طور پر ''ناول لکھنے کی ترکیب'' کے عنوان سے احمد بشیر کا لکھا ہوا ایک مضمون ہے۔ جس میں انھوں نے اپنی ناول نگاری کے بارے میں عجز کا اظہار کر کے مذکورہ ناول کے بارے میں اپنے ارادے اور کوشش کا ذکر کیا ہے۔

> ''میرے پاس کوئی چکر دار پلاٹ نہیں۔ میرے کردار بھی میرے ساتھ دور تک نہیں چلتے۔ ادھر میں نے آنکھ جھپکی اُدھر وہ گلیاروں میں گم ہو گئے' مگر کیا زندگی میں ایسا ہی نہیں ہوتا؟ کس نے زندگی پلاٹ کے مطابق گزاری ہے تو کیا میں فقط زندگی کے بارے میں لکھ رہا ہوں جیسی کہ میں نے کی؟''(۱)

ناول کے اسلوب اور انداز بیان سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ممتاز مفتی کے اسلوب سے استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے خاص طور پر بعض واقعات کی مماثلت اور ذیلی عنوانات کے تحت واقعات کا بیان ''الکھ نگری'' کے انداز نگارش کی یاد دلاتا ہے۔ کیونکہ بعض واقعات جو الکھ نگری میں ملتے ہیں جہاں احمد بشیر ان کے ہمراہ ہے اسی سے ملتے جلتے واقعات ''دل بھٹکے گا'' میں بھی ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر احمد بشیر کا فلمساز کے اجراء کے لیے احمد بشیر کی معیت میں بمبئی جانا اور پھر پیسے لینے کے لیے لاہور جانا اور اسی دوساں حالات خراب ہونا۔ فسادات اور لوٹ مار کا وقت اور ایمن آباد (جسے احمد بشیر نے اپنے ناول میں نور پور لکھا ہے) میں گاڑی کی لوٹ مار وغیرہ اور دیگر کئی واقعات میں مشابہت، احمد بشیر کے ماموں اشفاق حسین اور احمد بشیر کے ساتھ روز و شب کا گزرنا، اس خیال کو تقویت دیتی ہے کہ جب انھوں نے ناول لکھنے کی ٹھان لی تو ان کے ذہن میں جو ناول کا خاکہ تھا وہ الکھ نگری میں واقعات کی پیش کش سے ملتا جلتا تھا اس کے علاوہ ممتاز مفتی کے ساتھ ان کی خط و کتابت میں ناول کے بارے میں ان کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں شاید ممتاز مفتی نے اس ناول کے لیے اکسایا تھا۔ خطوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ ناول لکھنے کا مطمع نظر صرف ذاتی یادداشتوں اور ملکی سیاست کے ابتدائی خدوخال اور پیش رفت ہی نہیں بلکہ مابعد پیدا ہونے والے عوامل کو بھی محفوظ کرنا، اور ان پر اپنے مخصوص نقطہ نظر سے جائزہ لینا بھی تھا۔ ممتاز مفتی کے نام ایک خط میں ناول کے بارے میں رقمطراز ہیں: ناول میں تاریخی حوالوں کے بارے میں انھوں نے ممتاز مفتی سے بعض کتب فراہم کرنے کی بھی استدعا کی ہے اس کے باوجود کہ انہیں ناول کی تکنیک، اس کے پلاٹ کی تشکیل کے بارے میں مشکلات پیش آ رہی تھی۔ انھوں نے یہ ناول باقاعدہ تیاری اور سنجیدگی کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ اس کا اندازہ قاری کو ناول کے مطالعے کے

دوران ان کے بدلتے ہوئے انداز تحریر اور اقعات کی ترتیب و پیشکش بھی اسی خیال کو ظاہر کرتی ہے۔جن دنوں انھیں ناول لکھنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔تو انھوں نے اس سلسلے میں مستنصر حسین تارڑ سے بھی اس سلسلے میں مشورہ کیا تھا۔(۲) ایک اور مکتوب میں اس سلسلے میں پیش رفت سے آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''میرا ناول، ابھی ایک مہینہ لگے گا۔میں نے نو سو صفحے لکھ لیے۔بہت لمبا ہو گیا ہے مگر واقعات کی گرہیں کھلتی جاری ہیں۔میں کیا کروں۔''(۳)

ممتاز مفتی ہی کے نام اگلے خط میں لکھتے ہیں

''۔۔۔میں ناول میں پھنس گیا ہوں کیونکہ بھٹو کی پھانسی کے بعد سارا پس منظر بدل گیا۔آخری حصہ مجھے پھر سے لکھنا پڑے گا اور ابھی حالات واضح نہیں۔پتہ نہیں اندر کیا ہوا؟ یہ ناول تین حصوں میں ہے۔پہلا پیڑھیاں۔۔پاکستان بننے تک۔دوسرا، سیڑھیاں۔پاکستان سے یحیٰی خاں تک اور تیسرا، شہید گنج۔یحیٰی خاں ڈھاکہ اور بھٹو کی پھانسی۔اور یہ حصہ سخت بھی ہے اور سیاسی بھی۔اس لیے یہ ناول پاکستان میں چھپ بھی نہیں سکتا۔اسے کسی دوسرے ملک میں چھپوانے کا انتظام ہو جائے گا۔اس کا کل حجم ایلی (علی پور کا ایلی) کے لگ بھگ ہو جائے گا۔مجھے اس حصے کے لیے اپنی کتابوں کی سخت ضرورت ہے۔۔۔میں نے آئندہ زندگی میں لکھنے سے توبہ کر لی ہے۔مجھے کیا پڑی ہے۔یہ ایک ہی بہت ہے۔تمہارا کمال ہے کہ ساری عمر لکھتے رہے اور نہ تھکے۔مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔''(۴)

اگلا خط دیکھیے:

''میں نے ڈھائی جلدیں لکھ کر چھوڑ دیا ہے۔تیسری شہید گنج ڈھاکہ سے بھٹو تک کا حال میں بعد میں لکھوں گا۔ہندوستان والے کہتے ہیں کہ کتاب ہندی میں چھپ سکتی ہے۔اردو میں نہیں۔''

'' ناول کی دو جلدیں کتابت کے لیے نظر ثانی اور دیباچے کے ساتھ تیار ہیں۔ایک شخص نے ہامی بھری۔نیا ہے اور پہلی جلد اس کو دے آیا ہوں۔کل کاتب سے ملاقات ہوگی۔رائلٹی وغیرہ کی بات میں نے نہیں کی۔اس نے بھی نہیں کی۔چھاپ دے تو بہت ہے۔ناول بہت سخت ہے۔سچائی اس میں بہت

ہے، کینوس بہت وسیع ہے۔ سارا جہاں اس میں سما گیا۔ اب میں تیسری جلد یعنی ایوب سے بھٹو تک کا عہد نئے سرے سے لکھنے والا ہوں کیونکہ اب بہت سے حقائق سامنے آئے۔ پچھلا لکھا بیکار ہوا۔ ابھی اور بہت سی باتیں نہیں کھلیں۔ مگر یہ تو چلتا ہی رہے گا۔ اس لیے جو کچھ میرے پاس ہے اس پر قناعت کروں گا اور ساتھ ساتھ ڈھونڈتا بھی رہوں گا۔ اس ناول کا ایک حصہ جالندھر والے چھاپ رہے ہیں جو سکھوں اور فسادات کے متعلق ہے۔ انھوں نے کہا پورا پنجابی میں لکھ دو۔ مجھ سے نہیں ہوتا۔''(۵)

''آخر تم نے مجھ سے ناول لکھوا ہی لیا۔ ابھی ساڑھے چار سو صفحے لکھے ہیں۔ ۔۔۔ناول سے میں ڈرتا تھا مگر اب کوئی ڈر نہیں رہا۔ سمجھ لیا کہ مجھے تکنیک نہیں آتی مگر لکھنا تو آتا ہے۔ اور کوئی نیا راستہ نکالوں گا۔ ہمیشہ میرے ساتھ اسی طرح ہوا۔ یہ ناول بھی بالکل نئی قسم کا ہے اور شاید کسی کو پسند ہی نہ آئے اور آئے تو اس کا اونچا نام ہو۔ مگر مجھے اس کی بھی پروا نہیں۔ موضوع پاکستان کی تباہی ہے اور میرا بیان ہے اسے جو بچپن کے واقعات سوچتا ہوں اور اپنی ملاقاتیں یاد کرتا ہوں تو بڑا مزا آتا ہے مگر ندامت بھی ہوئی کہ بعض لڑکیوں کے ساتھ میں نے کمینہ پن کیا۔۔۔''(۶)

شاید یہ تفصیل اسی ناول ۔۔دل بھٹکے گا۔۔ کے متعلق ہے۔ جس کی دو جلدوں کے تکملہ، اشاعت اور تیسری جلد کی جاری تصنیف کا ذکر کیا ہے۔ غالباً اسی کو کاٹ چھانٹ کر کے سیکڑوں صفحات قلمزد کر کے ایک جلد میں شائع کیا۔ دراصل انھوں نے یہ ناول وقفے وقفے سے لکھا اور شاید طاق نسیاں میں رکھ دیا۔ یا پھر اس کی اشاعت ان کی ترجیحات کی فہرست میں کافی نیچے چلی گئی۔ بہر حال خاکوں کے مجموعے کی تدوین کے بعد یونس جاوید ہی نے انہیں آمادہ کر کے ہزاروں صفحات پر بکھرے مواد کو ترتیب دے کر اس کی تہذیب و تزئین کی تحریک دی۔ احمد بشیر نے ناول کا نام ''دل منزل منزل بھٹکے گا'' رکھا تھا مگر یونس جاوید نے اس کے طویل نام کو مختصر کر کے اسے 'دل بھٹکے گا' تجویز کیا۔(۷)

وہ لوگ جو احمد بشیر کی زندگی کے نشیب و فراز سے واقف ہیں ان کے علاوہ ان کی زندگی کے بارے میں معمولی آگہی رکھنے والے قاری کے لیے اس ناول کے مطالعے کے دوران ہی یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ یہ ان کی بڈ بیتی ہے۔ چنانچہ اس کے لیے اس ناول میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ اس

ناول کے تہ در تہ واقعات پکار پکار کر اپنے مرکزی کردار اور شاہد، احمد بشیر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً ناول کی کہانی نور پور (ایمن آباد، احمد بشیر کی جنم بھومی) سے کشمیر کی وادیوں اور پھر پنجاب کے میدانوں سے ہوتی ہوئی دہلی، جالندھر، گورداس پور، راولپنڈی، لاہور اور بمبئی سے کلکتہ، بنارس اور لکھنؤ اور کراچی سے لاہور اور اسلام آباد اور پھر لاہور مراجعت کے بعد واقعات کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہے ، آگے بڑھتی ہے۔۔کہانی کے اس طویل سفر میں قاری کا جن کرداروں اور واقعات سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان کی تاریخ اور جغرافیہ ڈھونڈنے کی قاری کو ضرورت نہیں پڑتی۔ کیونکہ ہر چند کہ بہت سے کرداروں کے حقیقی نام انھوں نے تبدیل کر دیئے ہیں مگر ابولاثر، بیدل صحرائی، مفتی، سید صاحب، عبدالمجید۔ وحید، قدرت اللہ، چراغ حسن، بخاری، نیاز علی کوثر وغیرہ۔ یہ وہ نام ہیں جن کے لیے قاری کسی تشکیک میں مبتلا ہوئے بغیر زندگی کے ان حقیقی کرداروں کو پہچان لیتا ہے۔۔مگر جہاں وہ ناول کی کہانی سے باہر نکل کر ایک صحافی اور تجزیہ نگار کا فریضہ ادا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ناول لکھتے ہوئے آغاز ہی میں انھوں نے مختلف ناول نگاروں سے اس کے بارے میں مشورہ اور راہنمائی بھی چاہی تھی۔ انھوں نے سارے نام من وعن اور صاف صاف لکھ دیئے ہیں۔ جس کے بارے میں انھوں نے آغاز ہی میں لکھ دیا ہے۔

> ''میں نے اس ناول میں بعض کرداروں کے اصلی نام بھی لکھ دیئے ہیں۔ وہ اتنے عظیم تھے کہ میں ان کو فکشن میں تخلیق نہ کر سکتا تھا۔ یہ میری سچائی ہے یا بدمعاشی۔ میں شرفا کو گلی بازار میں لے آیا اور بعض کی کمینگیاں، بے وفائیاں اور منافقتیں بھی میں نے بیان کر دیں مگر ایسوں کے اصلی نام میں نے نہیں لکھے کیونکہ میں ان سے نفرت نہیں کرتا۔''

احمد بشیر کا یہ ناول اردو کے شاہکار ناولوں میں شامل نہیں ہو سکا۔ شاید اس ناول کو اردو کے شاہکار ناولوں میں شامل ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔(۸) مگر احمد بشیر کے قلم سے نکلی ہوئی تحریر ہونے کے حوالے سے یہ ناول ناقدین اور ان کے ہمعصر مصنفین میں ایک عرصے تک زیر بحث رہا ہے خاص طور پر اپنے عہد کے ایک اہم نقاد ڈاکٹر پرویز پروازی کی اس ناول کے بارے میں پرکھ کو کافی اعتبار اور استناد ملا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے اخبارات و رسائل میں اس ناول پر تبصرے چھپے مگر اس ناول پر بھرپور مضمون ڈاکٹر پرویز پروازی ہی کا ہے۔ جس کے مضمون کو احمد بشیر نے یہ کہہ کر درخور اعتنا قرار دینے سے انکار کر دیا تھا کہ 'انھوں نے یہ ناول پڑھا ہی نہیں۔ البتہ حمید اختر کے مضمون پر ان کا کوئی تبصرہ نہیں تھا۔ احمد بشیر کی حمید اختر سے پہلی ملاقات اور ان کے آپس کے تعلقات کا ذکر پچھلے باب میں کیا جا چکا ہے۔ اس

ناول میں ان کا کردار وحید کے نام سے زیر بحث آیا ہے۔ جب انھوں نے یہ ناول پڑھا تو ان کی اس تحریر کی ہیئت ناول کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ:

''وہ زبان و بیان کی جملہ خوبیوں سے متصف ہے اور اپنے کھرے پن بلکہ منہ پھٹ ہونے کی شہرت سے بھی مالا مال ہے۔ زندگی میں اس نے پہلے بھی جراتوں کے متعدد مظاہرے کئے ہیں اس لیے اس سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ اپنی خودنوشت، آپ بیتی کے طور سچے اور کھرے انداز میں پیش کرے۔۔۔ لیکن مصلحت اندیشی کا یہ رویہ احمد بشیر کی افتادِ طبع کے خلاف ہے اور اس نے اپنی خودنوشت کو ناول کا نام دے کر غالباً زندگی میں پہلی بار سمجھوتہ کیا ہے۔'' (۹)

حمید اختر نے اپنے اس مضمون میں اس ناول کی ہیئت میں پائے جانے والی خامیوں کا تجزیہ بھی نہایت تکنیکی انداز سے کیا ہے۔ احمد بشیر کے بہت سے جاننے والوں اور دوستوں کی طرح ان کا بھی یہی خیال ہے کہ اگر احمد بشیر ناول کی موشگافیوں اور پلاٹ کی بنت اور کرداروں کے انتخاب میں نہ پڑتے اور اپنی خداداد قلمی صلاحیتوں اور افتادِ طبع کو کام میں لا کر سیدھی سیدھی اپنی سوانح عمری لکھ دیتے تو شاید یہ اردو میں لکھی گئی سوانح عمریوں کی صفِ اول میں جگہ پاتی۔ آگے چل کر اسی ضمن میں کہتے ہیں:

''ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے اپنے حالات پر مشتمل اس خوبصورت تصنیف کو ناول کا لبادہ پہنانے کی کوشش کیوں کی جب کہ اس کے کرداروں کی سرگرمیوں اور واقعات کے بہاؤ میں ناول کی ضرورتوں کے لحاظ سے کوئی ربط بھی موجود نہیں ہے لیکن جوں جوں ہم اس کے مطالعے میں آگے بڑھتے گئے ہمیں اس کی اس کوشش کی وجہ سمجھ میں آتی گئی۔'' (۱۰)

انہی دو احباب نے بطورِ خاص اس ناول پر لکھا۔ حالانکہ اس ناول کے مطالعے کے بعد راقم کا خیال ہے کہ یہ ناول ایک بھرپور مطالعے کا متقاضی ہے۔ کیونکہ اس ناول کے مندرجات اپنے قاری کو کثیر الجہاتی معلومات اور شعور کی رو سے ہمکنار کرتے ہیں۔ مذکورہ کتاب کے محدود صفحات اور مجوزہ خاکے کی پابندی کرتے ہوئے۔۔دل بھٹکے گا۔۔ پر سیر حاصل تبصرہ ممکن نہیں۔ مگر پھر بھی راقم نے کوشش کی ہے کہ مثالوں اور اقتباسات کے زمانی اور مکانی حوالوں اور افادیت کے جائزے سے اس ناول کی اہمیت کو اجاگر کیا جا سکے اور اس کے اردو ادب میں مقام کے تعین کے لیے پیش رفت کو مہمیز لگائی جا سکے۔

دل بھٹکے گا (ناول)

احمد بشیر کا یہ ضخیم ناول ۸۹۰ صفحات پر پھیلے ہوئے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ جسے فیروز سنز ،لاہور نے شائع کیا۔ انتساب کے الفاظ یہ ہیں:

''میرے پیارے ہمایوں شیخ کے دل کی ہوک کول شیخ کے نام۔ گاتی جاؤ' بھاتی جاؤ' بھاتی جاؤ لمبا سفر بھی ہنستے کھیلتے کٹ جاتا ہے۔''

ناول کے پس ورق پر انھوں نے اپنے بارے میں ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:

''اب میں بہت بدشکل، بوڑھا اور بیوقوف ہو چکا ہوں اس لیے تصویر چھپ جانا چاہیے۔ ابتدائی تعلیم ایمن آباد میں پائی۔ گریجوایشن سرینگر سے کیا۔ فلم سازی یونیورسٹی آف انڈیانا اور یونیورسٹی آف سدرن کیلی فورنیا سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور نہ ہو سکا حالانکہ گلی بازار میں بہت پھرا''(۱۱)۔

خالد احمد لکھتا ہے:' خدا جانے احمد بشیر نے لکھنے کا فن کہاں سے سیکھا اور اتنا علم کیسے حاصل کر لیا۔' خالد احمد ایک مہذب آدمی ہے اور مہذب آدمی پورا سچ کبھی نہیں بولتا''۔

امیر اجویریا لکھتی ہے۔' احمد بشیر آزادوں کا آزاد ہے۔ کسی سے ڈرتا ہی نہیں۔' ''مگر میں تو قدیم انسان کی حسیات کا مالک ہوں مجھے خطرے کا علم ہی ہوتا۔''

صبیحہ حسن کہتی ہے۔''احمد بشیر بالغ ہوئے بغیر بوڑھا ہو گیا۔ اب ایسے اُوت کو کوئی اپنے آپ سے کیسے بچائے۔ وہ طوفانوں میں لڑھکتا پھرے گا گول نہ ہوگا۔''(۱۲)

دل بھٹکے گا کے پہلے ابواب میں انھوں نے ہیرو، کا تعارف ،اس کا پس منظر اور اسی پس منظر میں تحریک پاکستان کے طویل منظر نامے کی تصویر کشی کی ہے۔ ناول کی کہانی کا آغاز مصنف کے ناسٹلجیا کا غماز ہے۔ وہ اپنی آخری عمر میں جب کہ وہ زندگی کے تمام پتے کھیل چکا ہے۔ اپنے آبائی علاقے ،نور پور میں آ کر اپنے ماضی کو آواز دیتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنے قاری سے اپنے ناول کے ان کرداروں کا تعارف کروا رہے ہیں کہ جن کے ساتھ قاری کو آگے دور تک کہانی کے زمانے میں چلنا ہے۔ یہاں ان کا انداز ایک منجھے ہوئے داستان گو اور کہانی نویس کا سا ہے۔ کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے اور اپنے قاری کو اپنے ماضی میں لے جانے کے لیے وہ داستانوی انداز میں اپنے لڑکپن اور اپنے ساتھ متعلق کرداروں کا تعارف بھی کرواتے ہیں۔ اور مافوق الفطرت واقعات کا رونما ہونا اور ماضی کا ایک دم چھلانگ لگا کر زمانۂ حال میں آ جانا۔۔ وغیرہ کسی داستان کے اسلوب کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ انداز بڑا

دلچسپ ہے۔اور ابتدا ہی میں ممتاز مفتی کے اسلوب کی طرف مرموز ہے۔مگر آگے چل کر یہ کرداران کی بھر پور زندگی کی گرد میں گم ہو جاتے ہیں۔یکسر منظر بدل جاتا ہے۔اور ناول کا یہ حصہ قاری کو اضافی معلومات کے طور پر یا ابتدائی ضمیمے کے طور پر محسوس ہوتا ہے۔کیونکہ انھوں نے ابتدا میں پلاٹ کی بنت جس ناول کے لیے کی ہے لگتا ہے کہ انھوں نے کہیں درمیان میں وہ ناول لکھنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ان کا ہیرو داستان سے نکل کر انسانوں میں آ گیا ہے۔جہاں کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے انھوں نے ڈرامائی عناصر سے کام نہیں لیا۔اسی لیے انہیں اپنی بات کو ترتیب میں لانے کے لیے طوالت نویسی سے کام لینا پڑا ہے۔نور پور سے نکل کر کہانی متحدہ ہندوستان میں داخل ہو جاتی ہے۔یہ زمانہ ہندوستان میں سیاسی کشمکش اور انگریز سامراج سے آزادی حاصل کرنے کی جدو جہد کا زمانہ ہے۔

آزادی کے بعد دونوں ملکوں کے عوام نے جس طرح ایک دوسرے کے خون کے ساتھ ہولی کھیلی اور سہاگ کیسے لٹے، قافلے کس طرح کٹے۔انسانی خون کے یہ احمریں چھینٹے۔تاریخ انسانی کی سب سے بڑی اس ہجرت کے ماتھے پر گہرا داغ ہیں۔پاکستان اور ہندوستان، دونوں کے دانشوروں اور حکومتوں نے جو تاریخ آنے والی نسلوں کو دی ہے اس نے ان ہمسایوں کے درمیان ایک لامتناہی فاصلہ پیدا کر رکھا ہے۔احمد بشیر کے ناول میں اس المیے کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی کی گئی ہے۔انداز ملاحظہ کیجیے۔

> "میری پرارتھنا ہے کہ ہمیں مسلمان کرلو۔کلمہ شریف تو مجھے پہلے ہی آتا ہے۔لاالہ اللہ۔۔ہمیں دھوکا دیتا ہے؟ کلمہ شریف مت پڑھ اپنے پلید منہ سے۔" ہندو بزرگ ہاتھ جوڑے ہوئے نیچے اُتر آیا۔ پیچھے پیچھے اس کے تین جوان بیٹے۔تین جوان بہویں، تین بچے اور ایک بڑھیا، جس نے سفید کھدر کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بزرگ ہندو سب کے آگے کھڑا ہو گیا اور نہایت عاجزی سے کہنے لگا۔مہاراج ہم تو دل میں پہلے ہی سے مسلمان ہیں۔ہمیں مسجد شریف میں لے چلو۔ہمیں نماز سکھا دو۔لاالہ ال۔۔آہ" وہ اللہ نہ کہہ سکا۔کسی نے اس کے سینے میں بلم بھونک دی تھی۔ اس کے منہ سے اللہ کی بجائے ایک چھوٹی سی آہ نکلی۔ہاہ! گپ بندھ جوان نے بلم کھینچ کر اس کے سینے سے نکالی پھر کلہاڑیاں اس کے بچوں کے ٹکڑے کرنے لگیں۔آخر میں انھوں نے بڑھیا کو مارا۔وہ کسی کام کی نہیں تھی اور اسے زندہ چھوڑنا بھی بیوقوفی کی بات تھی کیونکہ اس کا اب کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔پھر گپ بندھ جوانوں نے اس کی تینوں جوان بہوؤں کو چوٹیوں سے پکڑ لیا اور انہیں کھینچنے لگے۔(۱۳)

مشرقی پنجاب میں ہندوؤں، سکھوں اور ادھر بالائی پنجاب اور لاہور، گوجرانوالہ اور دیگر مسلم اکثریتی علاقوں میں کم مسلمانوں نے بھی نہیں کی۔ لوٹ مار، مار پیٹ اور عصمت دری کسی مذہب یا فقہ میں جائز نہیں مگر جب انسان حیوان کی سطح پر آ جاتا ہے تو پھر ہر چیز ہر مذہب میں جائز ہو جاتی ہے۔ احمد بشیر نے اس ناپاک جذبوں کے مظاہر کے بیان میں کہیں بھی ''مذہبی مصلحت'' سے کام نہیں لیا۔ ناول کے وہ ابواب جو قیام پاکستان کی کہانی سناتے ہیں۔ ان میں ان کی صاف گوئی، حق گوئی اور حقیقت نگاری بڑے بڑے مصلحین اور سجادہ نشینوں کی پارسائی اور زہد اور سیاسی رہنماؤں کی انسان دوستی کو شرماتی ہے۔ چند اقتباس بطور امثال پیش ہیں۔

''شہید گنج ہی کا ذکر ہے تم تو دس بارہ برس کے بچے تھے میں جوان تھا میں انگریزوں کی بندوقوں پر اچھل اچھل کر گرتا تھا۔ سکھوں سے کرپانیں چھینتا تھا۔ ایک گورے سے پستول چھین لینے پر میں گرفتار ہو گیا۔ تھانے میں مسلمان پولیس نے مار مار کے میری دو پسلیاں توڑ دیں مقدمہ چلا اور مجھے چار برس کی سزا ہو گئی مگر مجھے کوئی افسوس نہیں جو ہوتا تھا ہو گیا مگر کسی مولوی نے میری ضمانت کی کوشش نہ کی کسی نے میرے لیے کوئی وکیل کھڑا نہ کیا۔ کسی نے چار برس مجھ سے جیل میں ملاقات نہ کی ۔۔۔ چار برس کے بعد جب جیل سے نکلا تو مجھے پتہ نہیں تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ جب میں اپنے پرانے گھر پہنچا تو وہاں کوئی اور ہی مقیم تھا۔ اس نے کہا تمہاری بیوی اور بچوں کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا میں گلی گلی محلہ محلہ بھٹکتا رہا۔ لیڈروں کے پاس گیا۔ کارکنوں اور رضا کاروں سے ملا۔ کسی کو میرے بال بچوں کی خبر نہ تھی۔ میری بیوی ان پڑھ افغانی تھی۔ لاہور میں اس کا کوئی رشتہ دار نہ تھا ۔۔۔۔ پانچ مہینے کے بعد وہ مجھے سڑک پر بھیک مانگتی ہوئی ملی۔ پہلی نظر میں نہ اس نے مجھے پہچانا نہ میں نے اسے پہچانا۔ میرا ایک بچہ تھا وہ مجھے جانتا ہی نہ تھا ۔۔۔۔۔ وہ دن اور آج کا دن میں مسلمانوں سے نفرت کرتا ہوں۔ اگر شہید گنج مسجد نہ تھی گردوارہ تھی تو مسلمانوں نے مورچہ کیوں لگایا اور اگر لگایا تو پھر پیچھے کیوں ہٹ گئے؟ مسلمان دنیا کی سب سے ناشکری قوم ہے۔ میں تمہارے ساتھ ایک ڈبے میں بیٹھنا بھی نہیں چاہتا اس لیے کہ تم مسلمان ہو۔'' (۱۴)

"شام کو پتہ چلا کہ مسلم لیگ کے مقامی لیڈر کے گھر میں تالا پڑا ہے۔ اس کی چھت سے مسلم لیگ کا جھنڈا بھی اتر گیا ہے۔ وہ خود اپنے رشتہ داروں سمیت غائب ہو چکا ہے۔ اس پر گورداسپور کے مسلمان کچھ فکر مند ہوئے۔ ان کے چندوں سے جو اسلحہ خریدا گیا تھا وہ بھی دفتر میں موجود نہیں تھا۔ بعض کا خیال تھا کہ اسلحہ خریدا ہی نہیں گیا تھا۔ وہ قوم کا مال کھا کر بھاگ گیا ہے۔ یہ افواہ بھی پھیل گئی کہ گورداسپور پاکستان میں شامل نہیں ہوگا۔ اور یہی سن کر مسلم لیگ کا ضلعی دفتر صدر شہر کے مسلمانوں کو چھوڑ کر چندہ کھا کر لاہور بھاگ گیا ہے۔۔۔"(۱۵)

پاکستان بنتے ہی ملکی منظر نامے پر بھی اس ناول کے مندرجات سے بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ اس ناول میں بعض جگہوں پر جب وہ منظر نامہ بیان کرتے ہیں تو ان میں کرب، طنز اور واقعیت یکجا ہو گئے ہیں۔ اس کا ایک نمونہ دیکھیے:

"نور پور کے قاتلوں میں ذرا حیا باقی تھی انھوں نے ابھی تک کسی عورت کی عزت نہ لوٹی تھی وہ صرف ان کے کڑے اتارتے یا گلے کے بازو چھتے رہے۔ اگر کہیں انہیں قتل بھی کیا تو سیدھے سبھاؤ ان کی گردنیں کاٹ دیں۔ عورتوں کی بے حرمتی کی کوئی جرات نہ کرتا تھا۔۔۔ تھوڑے دن اسی بے حسی میں گزر گئے۔ بے حسی میں اس لیے، کیونکہ کوئی ان کو کچھ نہ بتاتا تھا۔ مسلم لیگ کے رضا کار لوٹ مار میں مصروف تھے۔ لیڈر وزارتوں کے لیے جوڑ توڑ کرتے تھے۔ قائد اعظم نے حلف اٹھا لیا تھا مگر خزانے میں ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ مشرقی پنجاب اور ہندوستان سے مہاجرین کے سر کٹے قافلے آ رہے تھے۔۔۔"(۱۶)

جب ہم احمد بشیر کی ناول نگاری کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ "دل بھٹکے گا" کا بیانیہ اسلوب بدل بدل کر سامنے آتا ہے۔ چنانچہ کہیں اس کے ابواب میں سیاسی تذکرہ نگاری کا رنگ بکھرا ہوا ہے۔ جہاں ان کے اندر سے صحافی بولنے لگتا ہے تو منظر میں موجود ہوتے ہوئے بھی جمال کا سراپا اور کردار پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ "دل بھٹکے گا" پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں ڈاکٹر پرویز پروازی نے کہا ہے کہ لوگوں کے بارے میں بے باکی سے لکھنے والے احمد بشیر نے جب اپنے بارے میں لکھنے کی باری آئی تو افسانوی تحریر کا گھونگھٹ نکال لیا۔ یعنی انھوں نے اپنی آپ بیتی کو جمال کے پردے میں چھپا لیا۔ اور سیدھی سیدھی خودنوشت لکھنے کے بجائے ناول کا پیراہن پہن لیا۔(۱۷)

فاضل نقاد کا مذکورہ ناول پر بھرپور مطالعہ اپنے اندر تنقید کا ایک معیار رکھتا ہے۔ مگر ان کے مذکورہ بالا تنقیدی جملے کی صحت محل نظر ہے۔ ناول کے دامن میں کئی ایسے واقعات موجود ہیں جن میں انھوں نے روایتی بے خوفی اور بے رحمی سے جمال کے کردار پر روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً نوجوان جمال کے دامن پر بھی ایسے داغ دھبے موجود ہیں جو اسے رسوا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ خاص طور پر پویٹ کی نوکری کے دوران اس کی نوجوان حرکات، گیندوں والی لڑکی، نور پور میں مشتاق اور کسی کی معیت میں راتوں کی وارداتوں کا بیان۔ تقسیم کے وقت ہندو لڑکی کے ساتھ پیش دستی اور پھر اروتا نامی بنگالی جسم فروش لڑکی کے ساتھ کلکتے میں شب بسری اور اس طرح کے کئی اور واقعات ایسے ہیں جنھیں قلمبند کرتے وقت ان کا قلم ذرا نہیں ہچکچایا۔ شاید انہی واقعات کے اظہار کے لیے انھوں نے اپنی ہڈ بیتی کو ناول کے پیرائے میں پیش کیا۔ کیونکہ سوانح عمری میں ایسے واقعات قاری پر منفی طور پر اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اس ضمن میں شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کی 'یادوں کی بارات' کی مثال دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر پرویز صاحب کا یہ کہنا شاید درست نہیں کہ۔۔ اپنی بات کہنے کا موقع آتا ہے تو افسانوی ادب کا گھونگٹ نکال لیتے ہیں۔ جب قاری کو پتہ ہے اور مصنف بھی اس امر سے واقف ہے کہ لوگ جمال کے روپ میں اسی کا چہرہ دیکھ رہے ہیں۔ تو پھر گھونگھٹ والی بات ذرا بے معنی سی لگتی ہے۔ ہاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جمال کی کردار نگاری میں اور احمد بشیر کے کردار میں کہیں کہیں قاری جمال کے کردار کو اپنے احساس پر حاوی کر لیتا ہے کہ جب درمیان میں احمد بشیر اپنی صحافتی درشتی کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے تو ناول کے ہیرو جمال پر سے اس کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب وہ خود احوال واقعی کے بیان میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ انہیں یاد ہی نہیں رہتا کہ وہ یہ تحریر ناول کے لیے قلمبند کر رہے ہیں۔ اسی کو پلاٹ کی بے ترتیبی اور ڈھیلا پن قرار دیا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے احمد بشیر نے ڈاکٹر پرویز پروازی صاحب کے موقف پر ''نیا زمانہ'' کے نام ایک مکتوب میں اس طرح اظہار کیا ہے:

> ''ڈاکٹر پرویز پروازی نے میرے ناول ''دل بھٹکے گا'' پر تنقید لکھی ہے۔ جس پر مجھ عاجز کی بہت تعریف کی۔ مگر اپنے تاثرات کو متوازن بنانے کیلئے مجھے ملاحیاں بھی سنائیں۔ مگر وہ چال چوک گیا اور میرے ذاتی مشاہدات اور تجربات کو جھٹلایا حالانکہ کوئی شہادت ان کے پاس نہ تھی۔ کہتے ہیں کہ جو کچھ احمد بشیر نے چراغ حسن حسرت سے سیکھا، مساوات میں اس کے کام نہ آیا۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ کیوں کام نہ آیا۔ کون سی غلطی مجھ سے ہوئی۔ میں جب تک وہاں رہا ایڈیٹوریل

رائٹر رہا اور میرا اداریہ لوگ پڑھتے تھے حالانکہ اداریہ بالعموم پڑھا نہیں جاتا۔ اگر شہادت مطلوب ہے تو میرے ایڈیٹر حنیف رامے سے پوچھ لیجئے۔ کونسی بے خوفی ہے جس کے لیے میں مشہور ہوں اور میرے ناول میں موجود نہیں اور کس کام میں نے چہرہ چھپایا۔ اپنی بھی کوئی ناکامی پر میں نے جھوٹ یا کم گوئی کے ڈھانٹے باندھے۔ پھر کہتے ہیں کہ اس کے بے باک قلم نے دوستوں کی بیویوں تک کو اپنی بے رحم صاف گوئی سے مجروح کرنے میں باک محسوس نہیں کیا۔ یا اللہ خیر میں دوستوں کی بیویوں کو اپنی بہنیں سمجھتا ہوں اور اپنے ۵۸ سالہ کیریئر میں دوستوں کی بیویوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اس ناول میں بھی کسی کا ذکر نہیں آیا۔ پروفیسر پرویز پروازی نے صفحے کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ میں نے بہت سوچا تو خیال آیا کہ کہ ان کا اشارہ کوپن ہیگن کی اس دلبر خاتون کی طرف ہے جس نے جنگل میں مجھ ندیدے پر اپنے جسم کی چادر ڈال دی تھی۔ وہ کسی جنسی ابھار سے مجبور نہ تھی۔ اسے مجھ پر رحم آ گیا تھا۔ مگر یہ بات لمبی ہے اور ناول میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ میرا اس خاتون سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے اس کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ (۱۸)

ناول میں تقسیم ہند کے واقعات، سانحات اور احساسات کے بعد موجودہ پاکستان میں حکومتی سطح پر، سیاسی سطح پر اور بیوروکریسی میں کیا کیا نظریاتی، انتظامی اور آئینی کھیلے ہوئے ان کا بھی مفصل بیان ملتا ہے۔ انھوں نے منجملہ امور پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اکثر جگہوں پر ناول نگاری کے تقاضوں اور ہیئتی پابندیوں سے بھی صرف نظر کیا ہے۔ شاید اسی لیے حمید اختر نے اس ناول کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے۔

"ہماری ایماندارانہ رائے اب بھی یہی ہے کہ اگر وہ اسے آپ بیتی کے طور پر تحریر کرتا اور اس میں سے دو تین سو صفحات میں بیان کردہ غیر ضروری اور غیر حقیقی واقعات اور ہیرو کی تقریروں پر مشتمل حصے نکال دیتا تو یہ ایک ایسی تاریخی اور بے مثال خودنوشت ہوتی جس کی اردو ادب میں کوئی دوسری مثال نہ ملتی۔" (۱۹)

دراصل احمد بشیر زمانہ حال کے رازدان تھے۔ وہ ماضی کے مطالعے سے حال کو دیکھتے ہوئے آنے والے وقت کا تجزیہ کرنے والے قلم قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک سچا صحافی بقول اقبال وہی کہتا

ہے جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے۔ مگر یہاں معاملہ سامنے آنے والے واقعات کے اظہار اور بیان کا نہیں بلکہ ناول کے میں پیش آنے والے واقعات کے وہ راوی نہیں بلکہ شاہد اور شریک تھے۔ مگر واقعات کو من و عن نہایت دیانتداری سے بیان کرنا اور بے لاگ بیان کرنا زندگی بھر ان کی عادت رہی۔ چنانچہ انہیں ان واقعات کو ناول کے روپ میں لانا پڑا۔ اور خود پر جمال کا ایسا مہین سا نقاب اوڑھنا پڑا جس میں سے غور سے دیکھنے والے کو ان کا چہرہ صاف نظر آتا ہے۔ مگر پھر بھی راقم کو ان کے ناقدین کی رائے سے اس حد تک اتفاق ہے۔ کہ اگر وہ اپنی بیتیوں کو خود نوشت سوانح کے طور پر لکھتے تو یہ ایک یادگار سوانح عمری ہوتی۔ کیونکہ۔۔۔ دل بھٹکے گا۔۔۔ وہ ناول نگار سے زیادہ وقائع نگار، مؤرخ اور سیاسی تجزیہ نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ مسلم و محکم ہے۔ اس ناول کے ابواب میں جہاں کہیں پر وہ اپنا نکتہ نظر بیان کرتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جمال کے بجائے کھرا اور کھرورا احمد بشیر بول رہا ہے۔ چنانچہ جمال کی کردار نگاری کا وہ رنگ صحیح طور پر جم نہیں پایا جو کہ بطور ہیرو اس کا حق تھا۔ پاکستان کی تخلیق کے بعد ناول میں ان کی خانگی زندگی، ذاتی مسائل، جن میں کراچی میں چراغ حسن حسرت کے ساتھ ریڈیو پاکستان میں ملازمت، زیڈ اے بخاری سے اختلاف کے بعد ملازمت سے بے دخلی، اور بے روزگاری کے ایام، پھر سرکاری ملازمت اور حفیظ جالندھری کی سرکردگی میں ملازمت اور ابن انشاء کی عشق بازیاں اور ممتاز مفتی کی معیت میں زندگی کا سفر۔ پھر امریکہ روانگی اور فلمی تربیت، وغیرہ کا ذکر ہے۔ کراچی کی سرکاری ملازمت کے دوران انھوں نے سندھی وڈیروں کی سندھیوں عوام کو پسماندہ رکھنے کی کوششوں اور مہاجروں کے اندر فی سبیل اللہ عدم تحفظ کے احساس کا تذکرہ بڑے دانشورانہ انداز میں کیا ہے۔ اس ناول کے مندرجات سے اس طرز احساس کا بھی اظہار بھی ہویدا ہے۔ جس نے دور حاضر میں کراچی جیسے روشن خیال اور روشن دماغ شہر کو لسانی عصبیت کا جہنم بنا دیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''۔۔۔ جمال نے سندھ اور سندھ کے عوام کے ابتر حالات، ان کی بے کسی اور ذلت، ان پر وڈیروں اور مہاجرین کے دباؤ کے بارے میں ایک لمبی تقریر کردی۔۔۔ ایک وضعدار نوجوان جسکی اچکن کے سارے بٹن بند تھے۔ سر پر جناح کیپ سجائے اس کے پاس آیا اور اجازت لے کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ ایک تمیز دار اور مہذب آدمی تھا۔ جمال نے اس کے لیے چائے منگوائی اور پوچھا۔ جی میرے لیے کیا حکم ہے۔ وہ بولے۔ حکم تو کچھ نہیں۔ جناب یہاں آپ ہی غیر سندھی ہیں۔ اس لیے ہماری تنظیم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو رکن

بنالیا جائے۔ اپنے دفاع کے لیے ہم نے ایک تنظیم بنائی ہے۔ جس کا صدر دفتر سیکریٹریٹ میں ہے۔ جی تو آپ اپنا دفاع کیسے کرتے ہیں۔ جمال نے پوچھا۔ وہ گلا صاف کر کے بولے۔ وہ یوں کہ ہم نے ہر محکمے میں ایک آدمی مقرر کر رکھا ہے جو ہمیں تمام اہم فائلوں کے بارے میں باخبر رکھتا ہے۔ کون کہاں کیا کر رہا ہے؟ کون سے پراجیکٹ زیرغور ہیں۔ کس کی ترقی ہو رہی ہے کس کا تبالہ ہو رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ دفتر کے جتنے اہم معاملات ہیں ان کے بارے میں مرکز کو باخبر رکھا جاتا ہے۔۔ تو پھر؟ جمال نے بےچینی سے پوچھا۔ پھر ہماری ورکنگ کمیٹی ان کیسوں کا فیصلہ کرتی ہے اور متعلقہ اہل کاروں کو ہدایت دیتی ہے کہ کس کیس کو کس طرح نمٹایا جائے۔ (۲۰)

ناول میں معلومات کا بہم پہچانا کہ جس کا کہانی سے کوئی بالواسطہ تعلق نہ ہو۔ نہ تو تکنیکی اعتبار سے قابل ستائش ہے اور نہ ہی عام قاری اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ بلکہ خواص کے لیے بھی ایسی معلومات کو حوالے کے طور پر پیش کرنے سے عذر ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسی سچائی کو ناول کی سچائی بھی تو سمجھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے اس ناول میں اپنی زندگی کے تلخ ترین عرصہ جسے انھوں نے ساڑھ ستی۔۔۔ کا نام دیا ہے۔ جو کہ ساڑھے سات سال پر محیط ہے۔۔ اس کا مفصل ذکر ناول میں بہت عجیب سا لگتا ہے۔ ملاحظہ کریں:

"ساڑھ ستی۔۔۔۔ اب یہاں ایک بات غیر متعلق ہے مگر سن لیجئے کیونکہ آخری تجربے میں یہی ایک بات متعلقہ ثابت ہوئی۔۔۔۔ ہر شخص کی زندگی میں دو مرتبہ ساڑھ ستی آتی ہے۔ ممکن ہے آپ نے یہ ترکیب سنی ہو مگر اس کا مطلب نہ جانتے ہوں۔ اس سے مراد لی جاتی ہے۔ انتہائی مصیبت مگر یہ ستاروں کی نشست کا مسئلہ ہے۔ جس میں زحل کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ زحل تیس برس میں دنیا کا چکر پورا کرتا ہے اور اگر اوسط عمر ساٹھ سال شمار کی جائے تو دنیا کے گرد اس کے دو چکر ہوئے۔ اس کا ایک درجہ ڈھائی برس میں پورا ہوتا ہے۔ اب جو لوگ زیادہ بدقسمت نہیں ہوتے اور سعد ستارے، مثلاً سورج مشتری اور زہرہ ان کے مددگار ہوتے ہیں۔ تو زحل ان کے لیے اتنا منحوس ثابت نہیں ہوتا یا ہوتا ہے تو ڈھائی برس کے بعد ان کے گھروں سے نکل جاتا ہے مگر جو

لوگ اس کی زد پر پوری طرح آجاتے ہیں ان کو یہ تین ڈھائے یعنی ساڑے
سات برس تک ایسا ذلیل اور بے بس کرتا ہے۔ کہ وہ مرنے کی دعا مانگتے ہیں مگر
موت نہیں آتی۔ ساڑھے سات برس کے بعد اچانک ان کی زندگیاں روشن ہو
جاتی ہیں اور وہ نئی قوت سے جینا شروع کر دیتے ہیں۔۔۔۔'' (۲۱)

یہاں پر احمد بشیر نے یہ انداز نگارش اختیار کرتے وقت شاید مولوی نذیر احمد کا اسلوب پیش نظر رکھا ہو کہیں کہیں وہ بھی اپنے قاری سے کردار سے باہر نکل کر خطیب یا مقرر کے طور پر مخاطب ہو جاتے ہیں۔ اردو کا پہلا ناول نگار ہونے کے باعث اس انداز کو جدت کے طور پر لیا جا سکتا ہے مگر ناقدین کے مطابق، ناول یا کہانی کا یہ انداز تحریر ناول کے تاثر کو مجروح کرتا ہے۔ بہر حال یہ وہ عرصہ ہے جب انھوں نے اپنی بہن کے سرمائے سے فلم بنانے کا سوچا۔ فلم بنانے کے دوران کیا کیا تلخیاں پیش آئیں۔ جمال کی نفسیاتی کیفیت، خود بینی، اپنے آپ کا مطالعہ۔۔۔ان سب کا مفصل ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد لاہور آمد اور دنیائے صحافت میں مراجعت۔ پیش آمدہ مسائل مثلاً جن دنوں وہ روزنامہ ''مساوات'' کے ایڈیٹر تھے۔ پارٹی کی پالیسیوں میں اغلاط کی نشاندہی پر مبنی مواد کو سنسر کر دیا جاتا تھا۔ اخبار کے دیگر کارمختاروں کی کارستانیوں کی وجہ سے ان پر اخبار میں عرصہ حیات تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ انھوں نے ناول میں اس دورانیے کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد جب قدرت اللہ (شہاب) سیکریٹری ایجوکیشن نے انہیں پاکستان کی فلم پالیسی مرتب کرنے کے لیے اسلام آباد طلب کر لیا۔ یہ وہ عرصہ ہے جب انھوں نے اسلام آباد میں زندگی کا معاشی طور پر خوشحال ترین عرصہ گزارا جب وہ ایک قومی فلمی ادارے (Pakistan State Film Authority) کے سربراہ بنے۔ اس ناول میں انھوں نے، اس دورانیے میں ایک طرف اپنے محکمانہ فرائض کی ادائیگی کی روداد اور اس میں بیوروکریسی کے ہتھکنڈوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ منظر نامہ احمد بشیر جیسا 'بے لحاظ' شخص ہی لکھ سکتا ہے۔ حالانکہ اس واقعے کے منقعت کیش خود احمد بشیر ہیں۔ قومی سطح پر بیوروکریسی کے اللوں تللوں کے بیان میں انہیں پتہ تھا کہ ان کے اپنے محسن اور اپنے مربی ممتاز مفتی کے روحانی پیشوا قدرت اللہ شہاب کے دامن پر بھی چھینٹے پڑیں گے مگر انھوں نے اپنی وضع نہیں بدلی اور سچ لکھ کر ہماری بیوروکریسی کی پاکستان جیسے غریب ملک کے لیے 'دردمندی' کی تصویر کشی کی ہے۔ اقتباس دیکھیے۔

''قدرت اللہ نے جمال سے پوچھا۔ 'آپ کام کتنے دنوں میں ختم کر لیں گے۔؟'
جمال نے کہا۔ جی ہفتہ بھر تو لگ ہی جائے گا۔

''نہیں اتنی جلدی نہیں۔'' وہ بولے

''جی مجھے کچھ سوچنا نہیں۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔''

''یہ تو میں مانتا ہوں۔ مگر سرکاری کام جلد کر دیئے جائیں تو دوسرے شبہ کرتے ہیں کہ کام ٹھیک نہیں ہوا ہوگا۔''

''مگر جی کام ہے ہی ہفتے بھر کا ٹھیک ہے مگر منہ سے کچھ نہ کہیں۔ ہفتے میں کام ختم کر لیں مگر اسکی ڈلیوری تین ہفتے کے بعد دیں۔ دو ہفتے کے لیے گھر سے ہو آئیں۔ اس کا ٹی اے، ڈی اے آپ کو الگ ملے گا۔ کیونکہ آپ ریسرچ کرنے جائیں گے اور یہ آپ کے پانچ ہزار کے اعزاز یے کے علاوہ ہوگا۔''(۲۲)

ناول پڑھتے ہوئے کئی جگہوں پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس واقعے یا بات کو احمد بشیر اگر اپنی فطرت کے مطابق بیان کرتے تو اس کا اثر اور تاثیر دوچند ہو جاتی۔ دل بھٹکے گا میں کردار نگاری پر اتنی توجہ نہیں دی گئی جتنی کہ تاریخ پاکستان میں رونما ہونے والے واقعاتی تسلسل کو دی گئی ہے۔ انہوں نے اس ناول میں تاریخی مغالطے بھی دور کرنے، بلکہ آنے والی نسلوں کو اپنے ماضی کا چہرہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ جس کے مطابق ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی اپنی تاریخ کی کتب میں اور نصابوں میں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ ان پر بہت ظلم ہوا۔ اور اس ظلم کا قصوروار ایک دوسرے کو ٹھیرا کر اس نفرت کی پرورش کی جاتی ہے۔ جس سے دونوں ممالک کے اشراف بقا اور نمو پاتے ہیں۔ احمد بشیر اس کوشش میں انھوں نے کہیں کہیں ناول نگاری کے تقاضوں اور ناول نگار کے منصب سے بھی اغماض برتا ہے۔ وہ ہر حال میں اپنے من آئی بات یا خیال اپنے قاری تک پہچانا چاہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس ناول کے مطالعے کے دوران اگر قاری کی دلچسپی برقرار نہ بھی رہے تب بھی وہ ناول پڑھنے کے بعد یہ نہیں محسوس کرتا کہ اس نے اس طویل ناول کے مطالعے میں وقت ضائع کیا ہے۔ بلکہ اس کے علم میں بہت سی ایسی باتیں آتی ہیں اور بہت سے حقائق سے پردہ اٹھتا ہے۔ خاص طور پر پاکستان بنتے ہوئے ایک پاکستانی قوم تشکیل پا رہی تھی۔ منظر ملاحظہ ہو۔

''لوٹ مار ایک فریضہ بن گئی۔ پلنگ کرسیاں یا صندوق پرانے کپڑے، دریاں، برتن، شیشے کے گلاس، پرنے لیمپ، کڑاہیاں، اناج کی بوریاں، گھی اور اچار کے مرتبان، چینی کے ڈبے، سروں، کندھوں اور پیٹھ پر لد لد کر گھروں میں پہنچنے لگے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ سامان قابل استعمال ہو۔ ہندو کا مال لوٹنا ثواب کا کام تھا۔ پاکستان ابھی معرض وجود میں نہ آیا تھا مگر اس کی نظریاتی بنیاد پڑ چکی تھی۔''(۲۳)

ان کا یہ آخری جملہ اپنے اندر ایک طنز، ایک کرب ایک داستان اور ایک تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔اسی طرح اس ناول میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم کے ردِعمل میں مسلم اکثریتی علاقوں کے لوگوں نے کس کس طرح غیر مسلموں کے قتال کے لیے مذہب کو استعمال کیا اور کس حد تک۔۔۔ یہ ساری باتیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

لالہ مایارام جونور پور میں رہتا ہے اس کی بیٹی لاہور میں پڑھتی ہے اور ہاسٹل میں رہتی ہے۔ لاہور میں شورش کی وجہ سے وہ اسے لاہور سے نور پور لے جاتا ہے کہ وہاں پر چین ہے مگر جمال دیکھتا ہے کہ راستے ہی میں انہیں بڑی بےدردی سے قتل کر دیا گیا۔بعد میں جمال کو پتہ چلتا ہے کہ انہیں نور پور کے بوبے قصائی نے اپنے دو ساتھیوں سے مل کر تھانیدار ذوالفقار علی شاہ کی ترغیب پر قتل کیا ہے۔اقتباس دیکھئے۔

''انھوں نے کہا تھا کہ ہندو جالندھر میں گاڑیاں کاٹتے ہیں۔مسلمانوں کی جان لیتے ہیں۔عورتوں بچوں اور بوڑھوں کا لحاظ نہیں کرتے۔شاہ بادشاہ نے کہا تھا کہ قتل کا بدلہ قتل ہوتا ہے اور یہ اسلامی کام ہے اسلام کے حکم کو ہم کیسے ٹال سکتے تھے۔ان کا جرم اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا کہ وہ ہندو تھے اور مسلمانوں پر مشرقی پنجاب میں جو ظلم ہوا ہے یہ اس کا جواب ہے۔''

اس قتل پر نور پور کا سماں ملاحظہ ہو۔

''تھوڑی دیر میں لالہ مایارام اس کے بھائی اور اس کی بیٹی کے قتل کی خبر نور پور کے گھروں میں پھیل گئی۔عورتوں کے رنگ زرد ہوگئے۔انھوں نے بچوں کو سینوں سے چمٹالیا۔مرد باہر سے فوراً ہی لوٹ آئے۔سب حیران تھے کہ نور پور میں ایسا شقی القلب کون ہو سکتا ہے، جو بیگناہ ہندوؤں کے خون سے ہاتھ رنگے۔اندازے سے کوئی کچھ نہ بتا سکتا تھا۔کیونکہ نور پور میں تو ایسا شقی القلب کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔گھر کے لوگ محلے والے اور بڑے بوڑھے جمال اور مشتاق سے کرید کرید کر تفصیلات پوچھنے لگے کیونکہ سب سے پہلے بدنصیب مقتولوں کو انھی نے دیکھا تھا۔اس رات روٹیاں زہر ہوگئیں۔''(۲۴)

اس کے بعد پرانی رقابت کی وجہ سے بوبے قصائی کو اس کے انہی ساتھیوں میں سے ایک قتل کر دیتا ہے اور الزام سکھ جتھے پر لگا دیتا ہے۔اس پر نور پر کا منظر کیا کہتا ہے۔اقتباس دیکھئے:

''بوبے قصائی کی میت پر عورتوں نے چھاتیاں پیٹ لیں اور بین کئے۔مولوی

عطا محمد نے جہاد کے فلسفے پر روشنی ڈالی اور کہا انہیں مرا ہوا نہ کہو۔ جو اللہ کی راہ میں شہید ہوئے کیونکہ وہ تو زندہ ہیں۔ بوبے قصائی کی ماں کو مبارکباد دو۔ کیونکہ اس نے ایک شہید کو جنم دیا۔ مسلمانوں کے دل اس کی تقریر سن کر عشق الٰہی سے بھر گئے۔"

حقیت اس کے برعکس تھی۔ بوبے قصائی کو بھٹی پہلوان نے مارا تھا جس کی وجہ اس کا جائداد کے معاملے پر اٹھنے والا تنازعہ اور کینہ تھا۔ جب جمال نے اسے احساس دلایا کہ اس نے یہ ظلم کیا ہے تو اس کا جواب، اس عہد اور اس ماحول میں انسانوں کے درمیان پیدا ہونے والی خودغرضی اور لالچ کا آئینہ دار ہے۔ جس نے انسانی جان کو ارزاں بنا دیا تھا۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

"کسی نے اڑا دی کہ بوبے قصائی کو شیفے بھٹی نے مارا ہے۔ بستی تو بہ توبہ کرنے لگی۔ شیفے بھٹی نے وضو کر کے مسجد میں قرآن اٹھا لیا کہ مجھے اس کے قتل کا دوسرے دن پتہ چلا۔ میرا تو وہ جگری دوست تھا۔ لالہ مایا رام کو ہم نے مل کر قتل کیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ہم نے وارداتیں کیں۔ ہم میں تو کبھی تو تو میں میں بھی نہ ہوئی۔ یہ بات بوبے قصائی کے بھائی نہ مانے۔ بات شاہ بادشاہ تک پہنچی تو انھوں نے تفتیش کے بعد فیصلہ سنایا کہ بوبے قصائی کو سکھوں ہی نے قتل کیا ہے۔ اب اگر اس کے بھائیوں نے قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کی در اسلام کے خادم شیفے بھٹی سے الٹی سیدھی بات کی تو ان کے سارے خاندان کو سولی پر چڑھا دیا جائے گا۔"

جس کے بعد جمال نے اس سے کسی بھی طرح اگلوا لیا کہ بوبے قصائی کا قتل اسی نے کیا ہے۔ اس موقعے کا منظر نامہ دیکھئے؛

"تم نے بہت ظلم کیا پہلوان، جمال نے کہا۔۔۔ بھٹی بولا: افسوس نہ کریں جی۔ وہ بڑا کتی کا بچہ تھا۔ قرآن کی جھوٹی قسمیں کھاتا تھا۔ مجھے کہا مجھے کچھ نہیں ملا مگر وہ زخمی ہو کر گرا تو میں نے اس کی ڈاب سے کڑوں کی جوڑی نکالی اور تین مندریاں۔ اس کی جان نکل رہی تھی اس وقت مگر اس نے دیکھ لیا کہ میں نے اس کا جھوٹ پکڑ لیا ہے۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بڑے آرام سے مرا جی وہ۔ (۲۵)

اسی پس منظر میں ایک اور اقتباس دیکھئے:

"مسلمان عورتوں کو اس لوٹ مار پر بڑا دکھ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بستے گھر برباد ہوئے مگر انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ بالآخر ہندو خاندان مسلمان غنڈوں کی

دسمبر: سے آزاد ہو گئے اور کیمپ میں ان کی جانیں محفوظ ہیں۔ انہیں اس بات کی بھی خوشی تھی کہ نور پور میں کسی عورت کی عزت نہیں لٹی۔ اس بات کا غنڈوں اور قاتلوں کو حوصلہ نہ ہوا تھا۔ شاہ بادشاہ سید ذوالفقار علی شاہ نے بھی اس کی اجازت نہ دی تھی۔ کیونکہ اسلام زنا کاری پر سنگسار کر دیتا ہے وہ صرف کافروں کے قتل عام ہی پر خوش تھے۔۔۔'' (۲۶)

دریں حالات جمال کے ذہن میں ابھرنے والے سوال احمد بشیر کے لاشعور کی تشکیل کا پتہ دیتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے محسوس ہوتا ہے کہ تقسیم کے اس عمل میں کیسے کیسے سانحے اور ان کے نتیجے میں افکار کی شکست و ریخت پوشیدہ ہے۔

''معلوم ہوتا تھا سب کچھ بیکار ہو گیا ہے۔ پیچھے جو کچھ تھا ختم ہوا۔ آج کا خون نالی میں بہہ رہا ہے۔ اور آنے والے کل کی صورت کسی نے دیکھی ہی نہیں۔ منزل نامعلوم پاکستان کہاں واقع ہے۔ ہندوستان کو راستہ کدھر سے نکلتا ہے۔ کوئی ہندوستان پاکستان مسلمانوں اور سکھوں کی پہچان کرا دے۔ اس خون کی پیاس کا ذمہ دار کون ہے اور یہ پیاس کیسے بجھے گی۔ کیا قائد اعظم خطا دار ہیں؟ کیا یہ ماسٹر تارا سنگھ کا کیا دھرا ہے؟ کیا یہ مہاتما جی کی مذہبی سیاست کا زہریلا پھل ہے۔ (۲۷)

قیام پاکستان کے وقت، لاہور میں جو غدر مچا اس '' جواب آں غزل'' کے منظرنامے کے بارے میں تاریخ پاکستان کے اوراق خاموش ہیں۔ ''دل بھٹکے گا'' اس اعتبار سے ایک اہم دستاویز ہے۔ کیونکہ لاہور میں مسلمانوں نے ہندوؤں سے جو سلوک کیا اس کی تصویر کشی کرتے ہوئے ان کا قلم کہیں بھی نہیں ڈگمگایا۔ فنکارانہ دیانت میں ڈوبا انداز ملاحظہ کریں:

''فرزندان اسلام نے شاہ عالمی کے راج محل پر بھی بالآخر قبضہ کر لیا۔ مگر اب کوئی ہندوؤں کی جان لینے کے درپے نہ تھا۔ مسلمانوں کو صرف ان کی دکانوں اور ان کے مال کی ضرورت تھی۔ حق شفع کے اصول پر ان دکانوں کا حق بھائی اور موچی کے جی داروں کا تھا۔ ایک رات طے شدہ منصوبے کے مطابق جوانوں نے پولیس کی نگرانی میں بند گلیوں اور مقفل دکانوں پر ربڑ اور پٹرول کا محلول چھڑک کر آگ لگا دی۔ لال دوائی اور گلیسرین کا محلول زیادہ کارآمد تھا مگر ان کا حصول مشکل تھا۔ ادویات کی ساری دکانیں ہندوؤں کی تھیں اور مسلمان ان کے کیمیائی خواص سے واقف بھی کم کم تھے۔'' (۲۸)

اس کے علاوہ واقعاتی حصوں کے علاوہ جہاں جہاں ناول نگار کے افکار بولتے ہیں قاری کو احمد بشیر کو پہچاننے میں دقت نہیں ہوتی۔۔ جمال کی کردار نگاری جو ناول کی کہانی آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ مکمل ہو کر قاری کے ذہن کے کینوس پر جمال کی تصویر بناتی ہے وہ ہو بہو احمد بشیر کی اپنی تصویر ہے۔ مثلاً جب احمد بشیر روزنامہ مساوات میں کام کرتے تھے۔انھوں نے مولانا کوثر نیازی کے بارے میں ایک کالم لکھا تھا جس کا عنوان تھا۔" یہ پری چہرہ لوگ" جس پر بھٹو نے فون پر ان کی سرزنش بھی کی تھی ۔اس ناول میں موصوف کو نیاز علی کوثر کے نام سے مذکور کیا ہے۔

> " حضرت بھٹو کو ایک مولوی کی ضرورت سیاسی طور پر ہے کہ نہیں؟ میں سارے مولویوں کے نقد علم سے واقف ہوں۔بھٹو صاحب میرے سر پر ہاتھ رکھیں تو میں باقی سب کا ناطقہ بند کر دوں گا۔کسی طرح ان کی شام کی محفل میں مجھے بھی لے چلو۔ایڈیٹر صاحب نے کہا۔شام کو وہ پیتے ہیں اور صرف اپنے خاص دوستوں سے ملتے ہیں۔مولوی صاحب بولے۔حضرت میں تو دنیادار آدمی ہوں۔"(۲۹)

اور اگر کوئی ابہام رہ جاتا ہے تو وہ اس اقتباس سے دور ہو جاتا ہے جو ناول کے باب نمبر چھتیس کا ابتدایہ ہے۔ملاحظہ کریں:

> "مولوی نیاز علی کوثر اپنی چرب زبانی کے سبب بھٹو صاحب کے وزیر اطلاعات ہو گئے ۔ایڈیٹر صاحب کی جگہ گورنر صاحب کے ایک منظور نظر کو ملی۔کچھ پن کے پتوں کی تجارت کرتے تھے، تھے تو بین آدمی مگر اخبار بھی کھانے لگا۔"(۳۰)

اس ناول کا قاری ہر نئے باب میں ایک نئے جہاں اور تجربے سے آشنا ہوتا ہے۔ہر چند کہ وہ تجربہ اس کا اپنا نہیں ہوتا۔مگر یہاں ایک قباحت اس کے علم میں شک کی گنجائش پیدا کر دیتی ہے۔ان کی بات آگے پہنچنے سے اور تاریخ میں ماخذ بننے کی اہلیت رکھنے کے باوجود معتبر حوالہ نہیں بن سکتی (ہر چند بعض نقادوں کا خیال ہے کہ سوانحی ناول تاریخی حوالہ بن سکتا ہے)۔ یہی واقعات اگر وہ سوانحی انداز میں لکھتے تو زیادہ معتبر حوالہ بنتے۔مگر احمد بشیر نے اپنے ناول کے لیے قاری کو مخمصے میں ڈال دیا ہے۔مثال کے طور پر انھوں نے سرکاری ملازمت کے دونوں ادوار میں رونما ہونے والے واقعات اور حکومتی اداروں کی کارکردگی کے لیے بہت سا مفید مواد مہیا کیا ہے۔جس میں کراچی میں لسانیت کی بنیاد پر گروپ بندی اور عصبیت کے ابتدائی خدوخال کو اجاگر کرتے ہوئے وہ کردار اور واقعات جو خود ان کی ذاتی معلومات اور تجربات کا حصہ ہے۔مگر ناول کے واقعات کا لباس پہن کر یہ حقائق " ناولی سچائیوں"

کا الزام لے کر مورخ یا محقق کے لیے درخور اعتنا نہیں رہتے۔ ہر چند کہ اس ناول کے واقعات مصنف کے تجربے، تجزیے اور مشاہدے کا حصہ ہیں۔ مگر بدیں وجہ نہ انہیں کسی باب میں سند کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اور بات جس کی طرف ڈاکٹر پرویز پروازی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ کہ انہیں تصویر بنانے کے بجائے بگاڑنے کا فن زیادہ مرغوب تھا۔ ان کے اس موقف میں جزوی صداقت موجود ہے۔ مگر اس کی وجہ ان کا وہ آئیڈیلزم ہے جس کے تحت ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ تصویر کے تمام تر خدوخال واضح کریں۔ اسی کوشش میں ان کا موئے قلم فنکارانہ چابکدستی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے حقائق کی تلخی میں ڈوب جاتا ہے۔ جس کے باعث انھوں نے بہت سی تصویریں جو اپنی دانست میں بنائیں مگر حقیقت میں بگاڑ دیں۔ دراصل ان کا ممتاز مفتی سے گہرا تعلق تھا۔ ممتاز مفتی کے ضخیم ناول "علی پور کا ایلی" اور الکھ نگری دونوں میں ممتاز مفتی نے احمد بشیر کا ذکر کیا ہے۔ جب وہ اپنا نام بشیر رومانی لکھتے تھے اور شاعری کرتے تھے۔ مانی کے طور پر ان کا ذکر اور بعض واقعات کی مطابقت، تسلسل اور بعض کی تفصیل کے طور پر الکھ نگری میں بھی ملتا ہے۔ مگر مفتی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے سچائیوں کو فنکارانہ مہارت سے ایک کہنہ مشق ادیب کی ریاضت کا پیراہن پہنا کر پیش کیا ہے۔ جبکہ احمد بشیر نے ایک روانی میں تمام واقعات قلمبند کر کے ان کی کاٹ چھانٹ کی۔ لیکن جنھوں نے ممتاز مفتی کے دونوں ناول پڑھے ہیں وہ اس بات کو محسوس کر سکتے ہیں کہ احمد بشیر نے شعوری یا لاشعوری طور پر کہانی کی پیش کش میں ایلی اور الکھ نگری کا تتبع کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ایک ادیب (ممتاز مفتی) اور صحافی اور ادیب (احمد بشیر) میں جو فرق پایا جاتا ہے وہی فرق ہمیں الکھ نگری اور دل بھٹکے گا میں ملتا ہے۔ احمد بشیر کیونکہ ہمہ وقت صحافی تھے۔ ان کے مضامین، خطوط اور کالم ان کے افکار کو واضح کرتے ہیں۔

ناول کے آخری صفحات میں انہی افکار کی بازگشت سنائی دیتی ہے جن سے ان کی صحافیانہ تحریریں عبارت ہیں۔ انھوں نے اپنے مضامین میں جہاں بھی کسی بھی جماعت یا شخصیت یا حکومت کو غلط راہ پر پایا۔ اس کی غلطی کی بے لاگ نشاندھی کی۔ وہ خواہ پیپلز پارٹی کی حکومت ہو، بھٹو ہو یا ضیاء الحق یا نواز شریف۔ ان کی اسی خداداد جرأت پر ہر حکومت ان پر نامہرباں رہی۔ حکمران ناراض رہے۔ جن میں ذوالفقار علی بھٹو بھی شامل ہیں۔ مگر ابتدا ہی سے وہ پیپلز پارٹی کے منشور اور بھٹو کی شخصیت سے متاثر اور حامی تھے۔ مگر انھوں نے پیپلز پارٹی کی حکومت، پیپلز پارٹی کے رہنماؤں اور وزیروں کی حرکات اور وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے کردار پر بڑے بے لاگ تبصرے کئے ہیں، تنقید کی ہے۔ "دل بھٹکے گا" میں بھی ان کی سیاسی بصیرت، اور سیاسی تجزیے کا رنگ، خاص طور پر آخری دو ابواب میں واضح طور پر جھلکتا ہے۔

ضیاء الحق کا مارشل لا، اور جماعت اسلامی کے رہنماؤں، خاص طور پر میاں طفیل محمد کا چیف مارشل لا ءایڈ منسٹریٹر سے گٹھ جوڑ۔ پاکستان کے مارشل لا کو عالمی طاقتوں کی سازش اور اس سلسلے میں امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر کی بھٹو کو دھمکی اور جس کے نتیجے میں ان کے خیال میں ملک پر طویل مارشل لاء کی رات طاری ہوگئی۔انھوں نے ضیائی مارشل لا ء کے خواص، ضیاء الحق کی شخصیت کا تذکرہ بڑے ہی عامیانہ، صحافیانہ انداز میں کیا ہے۔اور اس کے دور میں طوالت اقتدار کے لیے اسلام کے نام پر جس طرح اسلام کو بدنام اور لوگوں کو اسلام سے بیزار کیا گیا۔اس کے اجمالی بیان سے اس ناول کے آخری صفحات گرانبار ہیں۔حیرت کی بات ہے کہ انھوں نے مارشل لاء کے دور میں کوڑوں، عوامی احتجاج پر پولیس کی کارروائیوں اور ان کے سڑکوں پر عوام کے بہنے والے خون کا تو ذکر بڑے تاسف کے ساتھ کیا ہے۔انھوں نے مارشل لاء کے خلاف جمال اور اس کے اہل خانہ کو متحرک بتایا ہے اور اپنے خدشات کو(جو کہ دم تحریر سچ ثابت ہو چکے تھے) جمال کے بیٹے کے منہ سے کہلوایا ہے۔مگر انتخابات میں ملکی سطح پر ہونے والی دھاندلی اور اس کے نتیجے میں قومی سطح پر چلنے والی تحریک کا کما حقہ ذکر نہیں کیا۔جس میں سیکڑوں جوانوں بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کے خون سے سڑکیں سرخ ہوگئیں۔جس کو کچلنے کے لیے پاکستان کے تین شہروں میں مارشل لاء کا نفاذ کر کے فوج کو مداخلت کا جواز بخشا گیا۔انھوں نے پی این اے کی ٹیم کے ساتھ بھٹو کے مذاکرات کی کامیابی کو فوجی آپریشن فیئر پلے کے ذریعے سبوتاژ کرنے اور ایجنسیوں کو مارشل لاء کی راہ ہموار کرنے کا بھی مفصل تذکرہ کیا ہے اور غالب خیال ہے کہ درست کیا ہے۔مگر جہاں وہ بھٹو کی فہم وفراست، اس کے چین اسلامک اقدامات اور ارادوں کا ذکر کرتے ہیں۔وہاں اس کی تمام تر ذاتی خامیوں کے نتیجے میں سرزد ہونے والی اغلاط کو سی آئی اے کے کھاتے میں ڈال کر بھٹو کو مبرا قرار دینے کی سعی ناکام کرتے نظر آتے ہیں۔ (۳۱)

بہر حال دل بھٹکے گا، پڑھتے ہوئے قاری نئے نئے حقائق سے آشنا ہوتا ہے۔اسی طرح کے بہت سے واقعات اور مناظر سے قاری کو اس دور کی سیاسی ہلچل سے آگہی ہوتی ہے۔پاکستان کے بارے میں ان کا یہ ناول معدودے چند تحریروں میں شامل ہیں۔جو کہ

۱۔ حکومت سے منظور شدہ تاریخ کی قلعی کھولتی ہے۔اس اعتبار سے بھی اس ناول کی افادیت ثابت ہوتی ہے۔

۲۔ انھوں نے اس ناول کے ہر باب میں بغیر کسی منصوبہ بندی کے اپنی زندگی کے روزنامچے کو بیان کر دیا ہے۔اس ناول کی اہمیت کو مندرجہ ذیل نکات میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ ناول میں مصنف نے کشمیر کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ قاری کو کشمیری طرز معاشرت پر معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

۴۔ آزادی کے ہنگاموں میں لاہور کی منظر کشی، لوٹ مار میں جملہ اہل وطن کا کردار، سے

۵۔ تاریخ انسانی کی سب سے بڑی ہجرت کے افراد اور معاشرے پر اثرات، بحالیات کے محکمے کے اہل کاروں کی من مانیاں، اقربا پروری کے مظاہرے۔

۶۔ ناول میں مصنف نے نہایت دلیری سے کراچی میں لسانی تعصب کے ابتدائی نقوش کی عکاسی کی ہے۔

۷۔ نوزائیدہ مملکت میں بیرونی، خاص طور پر امریکہ کی مختلف شعبوں میں امدادی منصوبوں کے ذریعے ملکی انتظامی مشینری تک رسائی اور تسلط کی پیش رفت جو بعد میں موجودہ صورت حال پر منتج ہوئی۔

۸۔ پاکستان میں فنی اور فکری پسماندگی، فلم انڈسٹری کا مختصر مگر موثر جائزہ اور اصلاح احوال کی بین السطور مشورے اور سفارشات۔

۹۔ بیوروکریسی کے ہتھکنڈے، اور پاکستان کی ابتدا سے سیاستدانوں کی بے بسی اور بیوروکریسی کی بے حسی کا بیان ہے۔

۱۰۔ قیام پاکستان کے بعد قرارداد مقاصد کے پاس کروانے کی داستان اور اس کی غرض و غایت کو بڑے مدلل انداز میں بیان کیا ہے۔

۱۱۔ ماضی قریب کے سیاسی حالات سے آگہی، نیز ناول میں زندہ کرداروں کو پیش کر کے انھیں امر کر دیا گیا ہے۔

۱۲۔ پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی اور کمیونسٹوں کی سرگرمیوں اور ان کی ناکامی کی وجوہ کی نشاندہی۔

حواشی وتوضیحات

۱۔ دل بھٹکے گا۔ ص:۸

۲۔ بحوالہ مضمون ''آئیڈیل معاشرے کا خواب دیکھنے والا'' از مستنصر حسین تارڑ : شاید پچھلے برس کی بات ہے جب انھوں نے مجھے فون کیا کہ وہ ایک ناول لکھ رہے ہیں اپنی زندگی کے حوالے سے کچھ پیچیدگیاں درپیش ہیں تو کیا ہم مل بیٹھ کر ان کا کوئی حل نکال سکتے ہیں۔ ہماری ملاقات ہوئی تو کہنے لگے۔ یار میری زندگی میں کچھ ایسے واقعات ہیں جنھیں میں ناول میں سمونا چاہتا ہوں خاص طور پر رومانی نوعیت کے، تو سمجھ نہیں آتی کہ حقیقت کو فکشن میں کیسے ڈھالوں۔ صرف نام بدلنے سے تو کام نہیں چلے گا۔ لوگ جان جائیں گے اور کچھ ناراض ہو جائیں گے اور اگر رنگ آمیزی کرتا ہوں تو دل کہتا ہے کہ احمد بشیر کیوں جھوٹ بول رہے ہو۔ ساری عمر سچ بولا ہے اور اب آخری عمر میں کیوں مسلمان ہو رہے ہو تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ تم ہی کچھ مشورہ دو۔ تم یہ کرافٹ جانتے ہو۔ میں مشورہ کیا دیتا کہ ہر ناول نگار اپنی کرافٹ خود تخلیق کرتا ہے۔ اس نے دنیا سے جو سیکھا ہوتا ہے جس طور زندگی بسر کی ہوتی ہے اور جتنے دکھ سہے ہوتے ہیں اور جو سکھ اس کے نزیب میں ہوتے ہیں اور جتنی محبت اس کے حصے میں آئی ہوتی ہے یہ سب تجربے مل کر اپنے آپ کو بیان کرنے کے لیے ایک کرافٹ تخلیق کرتے ہیں۔ (مشمولہ نیا زمانہ، فروری ۲۰۰۵)

۳۔ خطوں میں خوشبو۔۔ ص ۱۱۲ بنام ممتاز مفتی

۴۔ ایضاً۔۔ ص:۱۱۳

۵۔ ایضاً۔۔ ص:۱۲۳،۱۲۲

۶۔ ایضاً۔۔ ص:۱۲۴

۷۔ یونس جاوید سے مصاحبہ

۸۔ ڈاکٹر صلاح الدین درویش کا اظہار خیال

۹۔ حمید اختر سے مصاحبہ

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ پس سرورق، ناول۔۔۔ دل بھٹکے گا۔

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ دل بھٹکے گا۔۔ ص:۳۳۸،۳۳۷

۱۴۔ایضاً۔۔ ص:۳۱۶

۱۵۔ایضاً۔۔ص۳۱۸

۱۶۔ایضاً۔۔ص۳۳۱

۱۷۔پس نوشت۔از ڈاکٹر پرویز پروازی

۱۸۔احمد بشیر نیاز مانہ ،لاہور

۱۹۔حمید اختر سے مصاحبہ

۲۰۔دل بھٹکے گا ص:۳۶۸،۳۶۹

۲۱۔ایضاً۔۔ص۶۵۱

۲۲۔ایضاً۔۔ص۸۰۸

۲۳۔ایضاً۔۔ص۳۲۵

۲۴۔ایضاً۔۔ص۳۲۱

۲۵۔ایضاً۔۔ص۳۲۹

۲۶۔ایضاً۔۔ص۳۲۵

۲۷۔ایضاً۔۔ص۳۲۶

۲۸۔ایضاً۔۔ص ۳۷۲

۲۹۔ایضاً۔۔ص ۷۸۵

۳۰۔ایضاً۔۔ص۷۹۶

۳۱۔ایضاً۔۔ باب نمبر۳۸

باب ۔(۵)

احمد بشیر کی مکتوب نگاری

مکاتیب احمد بشیر

جن دنوں وہ حکومت پاکستان کی طرف سے فلم میکنگ کی تعلیم کی تحصیل کے سلسلے میں امریکہ میں مقیم تھے ۔اس دوران انھوں نے اپنی شریک حیات اور اپنے دوست احباب کو متعدد خطوط لکھے ۔ان کے خطوط کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری جس احمد بشیر سے آشنا ہوتا ہے ۔وہ تمام انسانی رشتوں سے لبریز ہے ۔ان خطوط کو مکتوب علیہان کے اعتبار سے مندرجہ ذیل فصول میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

۱۔موری، (محمودہ بیگم، اہلیہ) کے نام خطوط جو انھوں نے انیس سو انھاون، انسٹھ میں امریکا سے لکھے ۔

۲-اپنے بچوں کے نام ۔۔جن میں بیٹا، بیٹیاں اور داماد شامل ہیں ۔

۳-دوستوں کے نام ۔۔ان میں سب سے زیادہ خطوط ممتاز مفتی کے نام ہیں ۔علاوہ ازیں ۔ارشاد حقانی، جمیل الدین عالی، مشفق خواجہ کے نام بھی شامل ہیں ۔

۴-منہ بولے بیٹے ۔مجید کے نام

جن میں سے اپنی پیاری شریک حیات کے نام لکھے گئے خطوط ہی مولفہ کو دستیاب ہو سکے ہیں جو اس مجموعے میں شامل ہیں ۔ان خطوں سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ خطوط ایک ایسے شخص نے لکھے ہیں جو ایک پیار کرنے والا فرض شناس باپ اور بیوی کی محبت میں مبتلا، اس کا مزاج آشنا اور نباض خاوند ہے ۔اپنی اہلیہ کو لکھے گئے جملہ خطوط امریکہ سے لکھے گئے ہیں جن میں انھوں نے امریکی طرز زندگی ان کے معائب ومحاسن کا تذکرہ بڑی دیانت داری سے کیا ہے ۔اپنے آپ کو بانگ دہل اشترا کی کہنے والا احمد بشیر کس فراخ دلی سے امریکہ کی تہذیب کے امتیازی خدوخال بیان کر رہا ہے ۔یہ حیرانی کی بات ہے ۔کیونکہ ہمارے ہاں یہ روایت رہی ہے کہ جس سے نظریاتی اختلاف ہو اس کی خوبیوں کو بھی پس پشت ڈال دیا جاتا ہے ۔مگر احمد بشیر کی شخصیت اس خامی سے مبرا تھی ۔چند اقتباسات دیکھئے:

'' یہاں کے لوگ بہت ہی اچھے ہیں اور ہر آسائش کا پورا انتظام ہے ۔مثلاً

میرے کمرے میں ائیر کنڈیشن کا پورا انتظام ہے۔ گرم پانی ہر وقت اور بے اندازہ موجود ہے۔ لیکن بالکل تعلیمی اور نیکی کا ماحول ہے۔ امن اتنا ہے کہ رات کے دو بجے بھی جنگل میں نکل جاؤ تو کچھ خطرہ نہیں۔۔۔ یہ عجیب دنیا ہے۔"(۱)

"یہاں کی عجیب رسم ہے کہ ہر آدمی یا عورت جو بھی سڑک پر ملے ہیلو یا گڈ مارننگ کہے بغیر نہیں گزرتا اور ہر آدمی ہر وقت مسکراتا ہے چاہے اسے تم مانو یا نہ مانو۔ ادب آداب اور اخلاق کا یہ حال ہے کہ کوئی آدمی گالی تو چھوڑ، معمولی سا لفظ یعنی ڈیم تک نہیں کہتا۔ نہایت مہذب اور نرم گفتگو کا رواج ہے۔ پروفیسر ایسے ہیں کہ بیان سے باہر۔ ان کی بیویاں بچے ہمیں گھر بلاتے ہیں اور گپ مارتے ہیں۔ یعنی معلوم نہیں ہونے دیتے کہ یہ کوئی غیر ملک ہے۔ ہر آدمی بے چین رہتا ہے کہ تم آؤ تو دروازہ کھولے۔ کمرے کھلے رہتے ہیں لیکن چوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غرضیکہ جنت میں جیسے فرشتے ہوتے ہیں ویسے ہی یہ لوگ ہیں۔ واقعی اگر دنیا پر راج کرتے ہیں تو ان کا حق ہے۔ لڑکیاں لڑکے کھانا ایک دوسرے کے ساتھ کھاتے ہیں۔ لیکن ان کو ایک دوسرے کے کمرے میں آنے کی اجازت نہیں۔ ساڑھے سات بجے سے زیادہ باہر رہنا منع ہے۔ ہر لڑکے اور لڑکی کے پاس کار ہے۔ اور سڑک پر ہر آدمی لفٹ دینے کے لیے تیار ہے۔ غرضیکہ عجیب لوگ ہیں۔ کپڑے بڑے عمدہ پہنتے ہیں۔ ہر روز نہاتے ہیں۔ بڑی جلدی سوتے ہیں اور بہت سویرے اٹھتے ہیں۔ میں تو حیران ہوں کہ کس دنیا میں آ گیا ہوں۔ بس یہاں تھوڑی بہت اداسی تمہاری ہے ورنہ میں تو یہاں عمر گزارنے پر تیار ہوں۔"(۲)

امریکہ سے لکھے گئے خطوط کے مندرجات ان کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو آشکار کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جس معاشرے کے لیے وہ رطب اللسان ہیں۔ وہاں اپنے فکرِ عیال اور خیال خاطر احباب بھی پیش نظر ہے۔ تحریر کا یہی وصف خط کو آدھی ملاقات بنا دیتا ہے۔ اپنے خطوط میں وہ صرف اپنے احوال ہی کا بیان نہیں کرتے تھے۔ بلکہ امریکہ میں بیٹھ کر اہل خانہ کی خیریت اور ان کے خرچے کے لیے بھی فکر اور پرسش کرتے تھے۔ ہر خط میں دوستوں، خاص طور پر ممتاز مفتی اور ابن انشاء، کے بارے میں بھی دریافت کرتے۔ اس کے علاوہ اپنی بیٹیوں کے بارے میں ان کے خطوط میں پیار بھرا تذکرہ ملتا ہے۔

ابھی ان کے متعدد خطوط کو زیورِطبع سے آراستہ ہونا ہے۔کیونکہ ان خطوں کی سطور میں اور بین السطور ان کی شخصیت ،حالات زندگی ،ان کے افکار و آدرش،احباب و اقارب سے ان کی معاملگی ،سلوک اور رویوں کی متحرک تصویریں جھانکتی ہیں۔ان مراسلوں کی زبان میں بھی انھوں نے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا جس سے پتہ چلے کہ ان کے یہ خطوط کسی باقاعدہ منصوبہ بندی کا نتیجہ ہیں۔تحریر میں افکار کا کوئی ابہام نہیں۔جس کی وجہ سے تحریر میں روانی اور سلاست آگئی ہے۔جو قاری کو تادیر اپنی طرف راغب رکھتی ہے۔اس کے علاوہ ان کے خطوط میں قویٰ کے مضمحل ہونے اور اپنی بیماری کا تذکرہ غالب کے خطوط کے مندرجات کی طرف لے جاتا ہے۔غالب نے اپنے متعدد خطوط میں اپنے بوڑھے،نحیف اور نکبت میں گرفتار ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔علاوہ ازیں ''خطوں میں خوشبو'' کے دیباچے میں نیلم نے بھی احمد بشیر کی غالب سے فکری و معنوی وابستگی کا جو تذکرہ چھیڑ کر رہنے دیا ہے،اس سے ان کے خطوں کے فنی پہلوؤں کو اس حوالے سے پرکھنے کا بھی ایک امکان پیدا ہو گیا ہے۔جب احمد بشیر کے سارے خطوط اور ان کے شذرات اشاعت کو پہنچ جائیں گے تو آنے والے نقادوں کی نظر ان کی مکتوب نگاری کے بارے میں بہتر طور پر پرکھ پرتیت کر سکے گا۔کتاب کی اشاعت کے بعد بھی ان کے بعض مکاتیب دستیاب ہوئے ہیں۔امید کی جاتی ہے کہ کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں یہ خطوط بھی شامل کر دیئے جائیں گے۔(۳)

خطوں میں خوشبو تنقید و تعارف:

احمد بشیر کی صاحبزادی،نیلم احمد بشیر نے اپنے والد کے لکھے ہوئے خطوط جمع کر کے۔۔۔خطوں میں خوشبو ۔۔۔کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیئے ہیں۔سرورق پر احمد بشیر کی نوجوانی کی محو مطالعہ تصویر ہے۔غالباً انہی ایام سے ان کی مکتوب نگاری کا آغاز ہوا ہوگا۔پبلشرز الفیصل ناشران ،تاجران کتب (لاہور) ۔کتاب کے پس ورق پر احمد بشیر کے مفتی کے نام ایک خودنوشتہ مکتوب(مؤرخہ ۱۹۴۶ ء) کا عکس ہے۔کتاب کے آغاز میں صفحۂ انتساب پر،شاعر رومان اختر شیرانی کا مصرع۔۔۔۔آج تک تیرے خطوں سے تیری خوشبو نہ گئی ۔۔قاری کی بصارتوں کو استقبال کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان خطوں کی اہمیت اور ماہیت کا بھی تعارف کروا دیتا ہے جس کے بعد(شاید سہواً ایک صفحہ تعارف سے پہلے جڑ گیا ہے۔حالانکہ اسے تعارف کے بعد ہونا چاہئے تھا۔) کے صفحے پر لکھا ہے۔۔شریک حیات ،موری کے نام خطوط۔امریکہ 59-1958۔جس کے بعد نیلم احمد بشیر کا لکھا ہوا۔تعارف کے عنوان سے پیش لفظ ان خطوط میں قاری کے لیے مزید دلچسپی پیدا کر دیتا ہے۔تعارف میں انھوں نے اپنے خاص

اسلوب میں اپنے پیارے ابا کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان، ماں بیٹی نے کس طرح ان خطوط کو دریافت کیا اور ان کے کیا محسوسات تھے۔ اور بطور ایک بیٹی اور بیوی کے ان لوگوں کے لیے ان مکاتیب کی کیا اہمیت تھی۔ کہ جس کے پیش نظر انھوں نے ان خطوط کو قارئین ادب کے لیے پیش کر دیا۔ نیلم کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

"۔۔۔کوشش ہے اور رہے گی کہ احمد بشیر جیسے مہان لکھاری اور گیانی کے قلم سے ٹپکا ہوا کوئی بھی موتی بحر فراموشی میں گر کر غائب نہ ہونے دوں۔ ان کے زریں شبد اپنے قارئین کے ذہنوں میں ہمیشہ چمکتے ستاروں کی طرح اجالا بکھیرتے رہیں۔(۴)

نیلم احمد بشیر سے اس اقدام کی بجا طور پر توقع تھی اور امید ہے کہ آئندہ بھی وہ اپنے والد کے قلمی شاہکاروں کو جو کہ اخبارات و رسائل کے بوسیدہ اوراق میں پوشیدہ ہیں۔ کتابی صورت میں لا کر آنے والی نسل کے لیے منظر عام پر لانے کا عمل جاری رکھیں گی۔ اس کا ارادہ انھوں کتاب کے پیش لفظ میں بھی ظاہر کیا ہے۔ امریکہ سے لکھے گئے خطوط پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے وہ پردیس میں اپنی بیٹیوں کی کمی شدت سے محسوس کرتے ہوں۔ انداز ملاحظہ ہو۔

"۔۔۔میرے نیلے سے کہو کہ اپنے ہاتھ سے مجھے خط لکھے۔ اور پوپا کیا اسی طرح کھلنڈرا ہے۔ گوپے کے سر پر بال اگے کہ نہیں۔ اور آجکل کیا بکواس کرتا ہے۔ مجھے ہمیشہ فکر رہتا ہے کہ اب وہ چلنے پھرنے لگی ہے۔ اسلم کے پیچھے بازار نکل جائیگی۔ اس کا خیال رکھنا۔۔۔۔۔تمہاری صحت کا کیا حال ہے۔ کیا ابا جی آئے تھے۔ ان کی صحت کیسی ہے اور مجید وغیرہ کا کیا قصہ سناتے ہیں۔۔۔"(۵)

"۔۔۔میں تو تمہارے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ میں جو رہ رہا ہوں تو تمہارے لیے اتنا مشکل نہ ہوگا۔ پھر تمہارے پاس تو میری پیاری گڑیاں بھی ہیں۔ اور میرے پاس تو ان کی تصویر بھی نہیں۔ اس لیے تم اسے خود کہو۔ آغا ریکارڈنگ کر دے گا اور انشا کے پاس الماری میں ٹیپ پڑے ہیں۔ ان کو پہلے صاف کروالینا کیونکہ ممکن ہے بھرے پڑے ہوں۔ ان کے ساتھ ہی مجھے بہت سی باتیں ٹیپ کر بھیجنا تا کہ میں تمہاری اور بچیوں کی پیاری آواز سنوں۔ گوپی سے باتیں کرنا۔ امید ہے اب وہ زیادہ بلونے لگی ہوگی۔ اور پوپی اور نیلی، مینی لاہور چلی گئی ہوگی۔"(۶)

ایک اور خط میں اپنی اہلیہ کو لکھتے ہیں۔

"مجھے تم بہت یاد آتی ہو اور آگے چل کر اور زیادہ یاد آؤ گی۔ کیونکہ تمہارے بغیر مجھے رہنے کی عادت نہیں۔ یہ جدائی بہت لمبی ہے لیکن جیسے تیسے گزرے گی۔ امید ہے کہ تم راضی خوشی ہو گی اور گانا سیکھ رہی ہو گی۔۔۔۔ممتاز سے کہو کہ تمہارے گانے پنجابی اور اردو آغا کے ذریعے ٹیپ کروا کر دفتر کے ذریعے مجھے بجھوائے۔ تمہاری آواز ہی سنتا رہوں گا۔ میری پیاری گڑیوں کو بہت پیار کرنا اور سب کی تصویریں مجھے فوراً بھیجو اور اپنی بھی۔۔۔"(۷)

مودی بیگم کے نام ایک اور خط کے مندرجات دیکھئے اور محسوس کیجئے کہ انہیں اپنی بیٹیوں سے کس قدر لگاؤ اور لگن تھی۔

"۔۔۔۔میری بیٹیوں کو بہت پیار سے رکھنا ان پر سختی نہ کرنا اور ان کی ہر خواہش پوری کرنا۔ پہلے تم سختی کرتی تھیں تو وہ میرے پاس فریاد کرتی تھیں۔ اب وہ کس کے پاس جا سکتی ہیں اس لیے ان کے ننھے ننھے دل نہ دکھانا۔"(۸)

کتاب کی فصل دوم میں بیٹیوں کے نام لکھے گئے خطوط میں احمد بشیر ایک پیار کرنے والا باپ ہے۔ امریکہ سے انھوں نے جو خط اپنی بچیوں کے نام لکھا ہے۔ اس کا لفظ لفظ محبت، چاؤ، لاڈ اور پیار کا آئینہ ہے لکھتے ہیں۔

"میرا پیارا سور بچہ نیلا جانو پا گو پا اُلو پٹھہ۔ تمہارا خط ملا۔ بہت بہت جی خوش ہو میں تم سے بہت ناراض تھا کیونکہ تم نے مجھے صرف ایک خط لکھا میں نے اس سے پہلے تمہیں لکھا تھا۔ اس کا جواب تم نے نہیں دیا۔ اب دیا تو الٹا جھوٹ بولا کہ میں نے نہیں لکھا۔ بڑا شیطان اور سور بچہ چالاک اومڑا ہے۔ ابا پر تہمت لگاتا ہے۔ اچھا بھائی لڑائی جھگڑائی معاف۔ بات یہ ہے کہ جو جو کچھ تم کہو گے میں لاؤں گا۔ آنے سے پہلے پوری لسٹ بھیجنا۔ سب کچھ سوچ لو۔ جو جو کہو سب کچھ لاؤں گا۔ ربن فراک کھلونے مٹھائی کتابیں یعنی جو کچھ بھی کہو۔ ابا کی جان تمہارے لیے ہے۔ ابا تو تمہارے حکم کا منتظر ہے۔ یعنی تمہارا نوکر ہے۔ تم مالک ہو۔ لیکن تم کو معلوم نہیں۔ تم کو کیا معلوم کہ ابا کیسا تمہارا نوکر ہے۔ یعنی ساری جان تمہاری ہے۔ اگر تھوڑی سی بچ گئی تو تمہاری امی کی ہے۔ ابا کا اپنا کچھ بھی نہیں

پیاری۔۔۔۔میری پیاری چڑیو! تم کیا جانو، تم مجھے کتنی پیاری ہو۔ سارا خزانہ میرا تم ہی تو ہو۔ پوپے سور بچے! تم کیا سکول جاتے ہو کہ نہیں۔ ابھی تک دڑ تگے مارتے ہو۔ خدا کے واسطے سکول جاؤ۔ اور بیٹا گم نہ ہو جانا۔ تم بڑی بھولی ہو۔ مجھے ہر وقت تمہارا فکر رہتا ہے۔۔ اور گوپا آج کل کیا بکواس کرتا ہے۔ پوری کہانی لکھو ۔۔۔اب جواب جلدی دو ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔۔۔'' (۹)

دسیوں سال گزرنے کے بعد بشریٰ (گوپی) کو خط میں لکھتے ہیں۔

''گوپو پیارے مجھے مانے کا کوئی فکر نہیں کیونکہ مانے کو تو تم سنبھال ہی لوگی اور وہ ہمت والی ہے مگر تمہارا سنبھالنے والا کون ہے۔ تم بالکل الو کی پٹھی ہو اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتیں۔ اور معمولی معمولی باتوں کو جو آ کر گزر جاتی ہیں۔ غم کھاتی ہو۔ کبھی نہیں کہتیں۔ سووٹ! مشکل زندگی دیکھنی ہے تو نیلم کی طرف دیکھو جسے اپنی مرضی کے خلاف واپس جانا پڑ رہا ہے۔ وہ قیدِ تنہائی میں جا رہی ہے۔ جہاں اس کا ساتھی اس کی زبان بھی نہیں سمجھتا۔ تم میری طرح ایک اچھے اور نارمل ماحول میں ہو اور اقبال تمہاری بات بھی سنتا ہے۔ تم اپنی صحت اور اپنے اعصاب کو سنبھال لو۔۔''(۱۰)

اس فصل میں لکھے گئے خطوط سے ان کے بعض خانگی معاملات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ عام طور پر ایسے خطوط شائع نہیں کئے جاتے مگر شاید مؤلفہ نے درونِ خانہ احمد بشیر کی زندگی کے یہ گوشے اس لیے بے نقاب کئے ہیں کہ ان کی شخصیت کا مطالعہ کرنے والے کے سامنے ان کی زندگی کی تصویر واضح ہو جائے۔ مثلاً سراج (داماد) کے نام لکھے گئے خط میں نیلم کے بارے میں ان کے خیالات اور پھر دوسرے داماد عباس کے نام خط میں سراج کے ساتھ رونما ہونے والے سانحے، اس کی لغزش اور اس کے مابعد اثرات کا (ہمدردانہ اور مشفقانہ) ذکر ان کے کرب اور ان کی ہمت اور عباس کے ساتھ ان کی قربت اور اعتبار کا آئینہ ہے۔

دونوں خطوں سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔ اپنے بڑے داماد سراج کو لکھتے ہیں:

''۔۔۔پتہ نہیں آپ دو ماہ کے عرصے میں نیلم کو سمجھ سکے یا نہیں۔ جتنا نیلم نظر آتی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ گہری اور عظیم لڑکی ہے۔ اسکو سچ بولنا اور سچائی پر ڈٹ جانا آتا ہے۔ مگر اس میں قربانی کا جذبہ بھی بے پناہ ہے۔ اگر آپ نے صحیح طور پر اسکے کردار کی عظمت کو نہ پہچانا تو بھی وہ آپ کو معلوم نہ ہونے دیگی۔ مگر پہچانیں گے تو اس کی روح میں رچ جائینگے اور شادی کا لطف اسی میں ہے۔ اس

کا دارومدار اس پر ہے کہ آپ کتنے گہرے رچے ہوئے اور رسیلے ہیں۔گویا
آپ کی خوش قسمتی کا دارو مدار آپ کی اپنی ذات پر ہے۔نیلم میں کوئی خرابی
نہیں۔اگر ہوتی تو اب تک آپ کو معلوم ہوگئی ہوگی۔اس کے خیالات پختہ اور کر
دار محکم ہے۔۔۔۔۔نیلم میں اس کے سوا کوئی نقص نہیں کہ وہ برتن توڑتی ہے
۔۔مگر دل نہیں توڑتی۔"(۱۱)

سب سے چھوٹے داماد عباس (قلزم کے شوہر) کے نام خط کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"یہاں ایسی مصیبتیں پڑیں کہ کسی کو کسی بات کا ہوش نہ رہا اور ابھی چکر جاری
ہے۔سراج نے اپنے ہاتھ پاؤں، سر گردن اور زبان کاٹ کر اپنی نئی بیوی کو دے
دی تھی۔جب اس نے اوٹنا مارنا شروع کیا اور چھرا لے کر اس پر لپکی اور دھمکی دی
کہ میں کاشی کو قتل کر کے چھوڑوں گی تو سراج صاحب گھر سے بچوں کو لے
بھاگے۔خود اس نے سراج کے بازو پر اتنے زور سے بوٹی کاٹی کہ لہولہان ہو
گیا۔بالآخر اس نے طلاق دی تو محترمہ نے ٹرک بلا کر گھر کا صفایا کر دیا۔ایک
تنکا بھی نہ چھوڑا۔۔۔۔۔"(۱۲)

ایک داماد کو دوسرے داماد کے احوال کے بارے میں آگاہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے اس داماد کو اپنے کس قدر قریب سمجھتے تھے۔اپنے اسی داماد کے ہاں انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے۔اپنے اس داماد سے ان کی قربت کا اندازہ اہل خانہ سے مصاحبوں اور گفتگو کے علاوہ دیگر خطوط سے بھی ہوتا ہے۔قندیل کے نام، ایک خط کے چند اقتباسات ملاحظہ کریں:

"عباس نے ہماری زندگی میں رونق بڑھا دی تھی اور تم تو ہو ہی ہماری قندیل۔
۔تم نے اپنا دکھ کا وقت بہت عقلمندی اور حوصلے سے گزارا۔اب مجھے بھروسا ہے
کہ تم آگے بھی اپنے معاملات کو دانشمندی سے سنبھالو گی اور عباس کو جذباتی طور
پر تقویت دو گی۔۔تم سب لوگ عباس کی زندگی کو سکون سے مالا مال کر دو تا کہ وہ
اطمینان سے اپنا کام بھی کر سکے اور گھر کو پر رونق بنائے۔۔۔"(۱۳)

اس فصل میں اپنے بیٹے ہمایوں احمد عرف ہومی کو امریکہ میں لکھے گئے خط نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔کیونکہ ان خطوط میں ان کے احوال، ان کی شخصیت، ان کے آدرش اور ان کے سیاسی اور عمرانی نظریات اور مذہبی عقائد کا مکمل کر اظہار ملتا ہے۔ہمارے پاس ہمایوں کے لکھے ہوئے وہ خطوط

نہیں کہ جن کے انہیں مدلل اور مفصل جوابات لکھنے پڑے۔ البتہ ان مکاتیب کے فحوائے عبارت سے اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ جواب طلب مکاتیب کا مفہوم یا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ چند ایک اقتباسات بطور نظیر پیش خدمت ہیں۔

'' میں اللہ کی اتھارٹی کو چیلنج نہیں کرتا مگر میرا تعلق اس کی تخلیق کی سائنس سے ہے اس کا بھید کائنات کی داخلی ہیئت بتاتی ہے کیوں آج تک کسی مسلمان عالم فلسفی یا سائنسدان نے آئن سٹائن کی Theory of Relativity کا جواب نہیں دیا حالانکہ اس کو اب سو برس ہوئے ہیں۔ اگر تم نے میرا خط یہاں تک پڑھ لیا ہے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اب تھوڑا اور پڑھ لو، حیران ہو جاؤ گے ۔۔۔۔۔۔ بیٹا بہت سے عجیب راز ہیں جو تم جیسے سیدھے سادے مسلمانوں کی قسمت میں نہیں۔ مگر اتنی گنجائش تو چھوڑو کہ ابھی بہت کچھ نامعلوم ہے تاکہ تم ذہنی ترقی کر سکو۔ (۱۴)

احمد بشیر نے اپنے بیٹے کو جو خط لکھے ان میں ایک باپ کی شفقت اور ایک دانشور کی باس ملتی ہے۔ اپنے بیٹے ہمایوں جسے وہ پیار سے ہوتی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ ان کا لہجہ شفقت پدری اور اپنی صفائی میں کہیں سخت اور کہیں دھیما پن لیے ہوئے ہے۔ مختلف خطوط میں ان کا انداز ملاحظہ ہو:

'' پیارے ہوتی ! یار جی تم نے اب کے بہت دیر کر دی اور نیلم نے بھی بہت راستہ دکھایا۔ ہفتے میں تم دونوں کا ایک ایک خط تو ہمارا حق ہے ۔۔۔۔ نیلم نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ تم پہلے سے زیادہ ذمہ دار اور سمجھ دار ہو گئے ہو اور بچوں سے تمہاری گہری دوستی ہے اللہ کا شکر ہے۔ مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ میرے چاند کی روح بہت پاکیزہ اور نرم ہے مگر لڑکپن ہے ۔۔۔۔ سو تم میری امیدوں کے مطابق پھل پھول رہے ہو اور ذہانت کی وجہ سے معاملات کو اور بھی اچھی طرح سے سمجھنے لگو گے۔'' (۱۵)

ایک اور خط کا آغاز یوں ہوتا ہے:

پیارے بیٹے ! میں نے تمہیں بہت سے خط لکھے تھے مگر بھیجے نہیں تھے کہ شاید تم ناراض ہو جاؤ۔ مگر اب سوچا کہ ناراض ہو جاؤ مگر بطور باپ میرا فرض ہے کہ تمہیں تمہاری غلطیوں سے آگاہ کر دوں ۔۔۔ عزرائیل سے نہیں ڈرتا مگر اپنے

بچوں کے سامنے ہاں جی ہاں کہتا ہوں یا چپ رہتا ہوں۔ مجھے کسی پر کچھ ثابت نہیں کرنا میں کسی سے بڑا، کسی سے سیانا، کسی سے طاقتور نہیں۔''(١٦)

ان خطوط میں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے ہمایوں کے موقف کو اس کی فرمائش سمجھ کر اس کا احترام کرتے ہوئے اپنے کئے دھرے کے بارے میں اپنی صفائی اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کی تحریر میں ''فرمائشی ملال'' جھانکنے لگتا ہے۔ ہمایوں نے اپنے باپ کو ہمیشہ اس بات کا احساس دلایا کہ انھوں نے ساری زندگی جن آدرشوں کے سہارے گزاری وہ سب غلط تھے۔ بقول نیئم ہمایوں نے ابا کو زندگی بھر ٹکٹکی پر لگائے رکھا۔ اپنے اسی خط میں آگے چل کر اپنے بارے میں کہتے ہیں۔

''ایک بات پر البتہ مجھے بھی حیرت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ٢٥ برس کی عمر سے پہلے جب ابھی میں نے لکھنا بھی شروع کیا تھا، ہندوستان کی بڑی ہستیوں سے میرے برابر کے تعلقات تھے۔ مصنفوں ادیبوں میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، میرا جی، خواجہ احمد عباس، غلام عباس، عصمت چغتائی، جوش ملیح آبادی، اوپندر ناتھ اشک، فیض احمد فیض، تاثیر، حفیظ جالندھری سے میں ٢٥ سال کی عمر میں ملا۔ صحافیوں میں مولانا چراغ حسن حسرت، مولانا غلام رسول مہر۔ سر عبدالقادر، عبدالمجید سالک وغیرہ۔ گویوں میں بڑے غلام علی خاں، جن کا گانا سننے کے لیے میں اور میری دوست صبیحہ حسن میاں بیوی بن کر ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ اور وہ ہمیں پلاؤ بھی کھلاتا تھا۔ اس بات کا تمہاری ماں کو پتہ ہے۔ صبیحہ کی اور میری دوستی پاک صاف تھی اور اب بھی ہے۔ پھر سارنگی نواز استاد بندو خاں (اس کے علاوہ بندو خان کبابیا جو دہلی سے میرا دوست چلا آتا تھا) گاما پہلوان، امام بخش رستم ہند اور بھولو پہلوان اور گاما کلو والا۔ لیڈروں میں مولانا عطاالله شاہ بخاری، شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین اور اب تو بہت سے نام یاد بھی نہیں رہے۔ مثلاً صوفی تبسم، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر اجمل کو میں بعد میں ملا۔ تو پیارے بیٹے! کوئی بات تو مجھ میں ہوگی جو اتنے بڑے لوگ اور مختلف میدانوں کے لوگ مجھے برابر بٹھاتے تھے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ تمہیں مجھ میں کچھ نظر نہیں آتا۔ اور تم مجھے بیوقوف، لامذہب اور بیکار آدمی سمجھتے ہو اور بات بات پر میری مذمت کرتے رہتے ہو۔ اگر تم ایک مکمل طور پر روایت پسند آدمی

ہوتے تو بھی اب نہ کرتے۔ کیونکہ میں تمہارا باپ ہوں اور باپ کو روایت پسند لوگ قابل احترام سمجھتے ہیں۔ چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہوں۔ تم اگر مکمل طور پر روایت پسند ہوتے تو مجھے کہتے ہاں تم نے بہت سفر کیا ہے اب عصا پھینک دو۔ دریا کے کنارے بیٹھ جاؤ۔ آؤ میں تمہارے پیر دھودوں اور یہ بتاؤ کہ تم نے زندگی میں کیا کھویا اور کیا پایا اور کیا تم میرے لیے کوئی تحفہ بھی لائے ہو؟ مگر تمہیں تو میری ساری زندگی ہی مہمل اور بیکار لگتی ہے۔ اس کا میں اقرار کرتا ہوں اور دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کہ تم نے میرے بڑھاپے کی لاج رکھی اور مجھے اتنا خرچ دیا کہ میں بے فکر ہو جاؤں مگر میں نے تمہاری آنکھ میں محبت کی گرمی اور احترام کی نرمی نہیں دیکھی تو کیا مجھے خرچ دے کر تم صرف اپنا اسلامی فرض پورا کر رہے ہو؟ پھر تو یہ زکوۃ خیرات ہوئی خوں کا دباؤ نہ ہوا۔ میرا قصور فقط اتنا ہی ہے نا کہ میں کسی ایسے نظام کی تلاش میں ہوں جس میں بوڑھے لوگ زکوۃ خیرات نہ کھائیں اور سب کو ملتی بھی کہاں ہے بلکہ ریاست ان کی کفالت کرے کیونکہ انھوں نے جوانی میں ٹیکس دیئے ہیں اور کام کیا ہے۔ کیا یہ کفر والحاد ہے؟ حکیم کو اپنی حکمت پر ناز ہوتا ہے پہلوان کو اپنی پہلوانی پر، ادیب کو اپنی ادبی تخلیق پر، مولوی کو اپنی دین داری پر، سیاستدان کو اپنی بصیرت پر، حکمران کو اپنی حکومت پر۔۔۔ مگر یہ کیا ستم ہے کہ تم کاروبار میں کامیاب ہوئے تو حکیم بھی ہو گئے، پہلوان بھی ہو گئے، سیانے بھی ہو گئے اور لگے ہر ایک پر تنقید کرنے، ہر ایک کی توہین کرنے اور ہر بات پر بڑا اور برگزیدہ بننے۔۔ تمہارے دل کا صحن بڑا کشادہ ہے مگر ذہن ایک بند گلی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ سچائی کے سو روپ ہیں۔ ہر ایک کا زندگی کرنے کا انداز اپنا ہے۔ اور ہر ایک کو زندہ رہنے کا حق ہے۔ اگر ہو سکے تو لوگوں کو جینے دو، کسی کی توہین نہ کرو کچھ عاجزی اختیار کرو۔ بندے بنو، خدا نہ بنو۔ میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں وہ سب کچھ دے جس کی تم آرزو کرو۔ خوش رکھے، با صحت رکھے اور بہت پیسہ دے۔ میری دعا یہ بھی ہے کہ خدا تمہیں جرأت تحقیق بھی دے۔ یہ خط جو میں نے لکھے ہیں مہربانی کر کے پڑھ لینا اور میری گستاخی معاف کر دینا۔ یہ بھی سوچو کہ کہیں تم Arrogance of success اور

Authority of ignorance کے شکار تو نہیں ہو گئے۔ اگر تم کہیں بل گیٹس ہو گئے تو آدھی دنیا کو زندہ جلا دو گے اور اس میں تمہارے ماں باپ بھی شامل ہوں گے۔"(۱۷)

یہ تو تذکرہ تھا ان خطوں کا جو انھوں نے اپنے اہل خانہ اور عیال کو لکھے۔ جن کی روزنوں سے ایک پیار کرنے والا باپ اور محبت کرنے والا شوہر جھانکتا ہے۔ یہ احمد بشیر اپنے درون خانہ لکھے گئے دوسری فصل میں دوستوں اور احباب کے نام لکھے گئے مکاتیب کے آئینے میں وہی احمد بشیر نظر آنے لگتا ہے۔ جسے دنیائے صحافت اور اہل فن بخوبی پہچانتے ہیں۔ ان کا انداز ان کے کالموں اور مضامین کی یاد دلاتا ہے۔ اور کہیں کہیں ان خطوط سے ان کی خاکہ نگاری بھی جھانکتی ہے۔ خاص طور پر اپنے مربی اور پیارے، ہمدم دیرینہ ممتاز مفتی کے نام لکھے گئے بعض خطوط میں ان کا انداز ان کے خاکہ نگاری کے انداز کی یاد دلاتا ہے۔ ممتاز مفتی کے نام دوستانہ بے تکلفی سے بھرپور انداز میں لکھے گئے خطوط اپنے اندر ایک جہان حظ لیے ہوئے ہیں۔ اقتباس دیکھئے۔

"میں نے گذشتہ برس سے تمہیں پڑھنا چھوڑ رکھا ہے کیونکہ تم اپنی پرانی کہانیاں دہراتے ہو۔ تم پہلا سا معیار بھی قائم نہ رکھ سکے۔ بیان کی شوخی بھی گئی اور کرافٹ میں بھی تم نے اپج نہ دکھائی۔ یہی تمہارا طرہ امتیاز تھا ورنہ پہلے بھی تمہیں نہ پڑھتا۔ بات کرنی تمہیں آتی تھی اور اب بھی آتی ہے مگر بات میں بات نہ رہی۔ پہلے عورت کا عورت پن دکھاتے تھے تو پڑھنے والے ماں بہن کو حیرت سے دیکھنے لگ جاتے تھے جیسے پہلے انہیں کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔ وہ دیوار کی طرف دیکھتی تھیں تو اس پر چہرے نمودار ہونے لگتے تھے۔۔۔۔ ایک طرف تم اتنے عقیدہ پرست پاکستانی ہو۔ دوسری طرف ہندو دیو مالا اور ہندو روایت تمہاری جان نہیں چھوڑتی۔ اور اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ اب اویس قرنیؒ، داتا گنج بخشؒ اور امام بری لطیفؒ تو تمہیں بد اعمالیوں کی سند دینے سے رہے۔ ناچار تمہیں بھگتوں، مندروں اور پجاریوں کا دامن پکڑنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ ہندو روایت کے شریر میں بھگوان بولتا ہے۔ تم کامنا کے پجاری، دھرم کو چھوڑ نہیں سکتے۔ تمہیں ہندو روایت ہی میں پناہ پکڑنی پڑتی ہے۔ مگر تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارا قاری اس سے بے خبر ہے۔ تمہارا ابلاغ نامکمل رہتا ہے۔ میں نے تمہاری بات سمجھ لی

کیونکہ میں اس روایت سے واقف ہوں۔مگر تم یہ کہانیاں کس لیے لکھ رہے ہو؟
آج کا قاری زندگی سے گریزاں ہے۔وہ حقائق کا سامنا نہیں کر سکتا۔اسے فرار
مطلوب ہے۔۔۔۔"(۱۸)

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"۔۔تم نے ساری عمر بجو کی طرح قبریں کھودیں۔اندر سے کیا نکلا؟ جو کچھ تم نے
پایا دھرتی کے اوپر بکھرا ہوا پایا۔یہ جوامردووں کے پیڑوں کے نیچے بے کس، بے
بس بابے بیٹھے ہوئے ہیں،ان کے پلے کچھ بھی نہیں۔یہ سارے طبقاتی سماج
کے مارے ہوئے ہیں۔انہیں روٹی چاہیے علاج چاہیے گھر چاہیے جہاں اپنے
آخری دن اطمینان سے پورے کر سکیں۔تم خوامخوا ان کے گنجے سروں پر عمامے
باندھ دیتے ہو۔اصل میں تم علت اور معلول کے رشتے کو نہیں سمجھتے۔۔۔۔۔تم
بے شک ملامتی ہو مگر شاہ حسین نہیں بن سکتے۔بلھے شاہ کا تم نے نام بھی نہیں سنا
ہوگا کیونکہ بغاوت کی جرأت تم میں نہیں۔تم تو ہر دو ٹکے کی داڑھی سے ڈر جاتے
ہو۔تمہاری دنیا دل کی دنیا ہے۔"(۱۹)

احمد بشیر کی یہ بولتی تحریر کس طرح دوستی کے رشتے کی تصویر کشی کرتی محسوس ہوتی ہے۔اچھی تحریر کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے قاری کو اسی عہد میں لے جاتی ہے۔ممتاز مفتی کے نام ایک اور خط کی جھلکیاں دیکھیں۔

"عکسی کے استعفے سے مجھے بہت صدمہ ہوا۔اگر چہ حیرت نہیں۔۔اگلے روز میں
سوچ رہا تھا کہ کلچرل منسٹری کے سارے ادارے ختم ہوئے ایک عکسی کے ادارے
کو چھوڑ کر۔مگر لوگوں نے اب تو کچھ بھی نہیں چھوڑا۔صرف کلرک باقی
ہیں۔۔یہاں یہ افواہیں دوسری مرتبہ زور پکڑ رہی ہیں کہ شہاب صاحب کو
وزارت وغیرہ پیش کی گئی ہے اور وہ مان جائیں گے۔میں لوگوں سے جھگڑتا ہوں کہ
اگر شہاب کو میں جانتا ہوں۔تو یہ ناممکن ہے۔مگر کہنے والے اصرار کرتے ہیں۔تو
تم ان کو اچھی طرح سمجھا دو۔خبردار جرنیل تو عنقریب بھاگنے والا ہے"(۲۰)

قاری یہ خط پڑھتے ہوئے فوراً سمجھ جاتا ہے کہ یہ وہی عہد ہے جس کا تذکرہ ان کے اکثر مضامین میں ملتا ہے۔۔یعنی ضیائی مارشل لاء کا عہد جب ان کے قلم پر قدغن لگانے کی ہمہ جہت کوششیں کی گئیں۔ان

پر رزق بالقلم کے سارے دروازے بند کر دیئے گئے۔اس خط سے اس عہد میں حکومتی پالیسیوں کی قلابازیوں اور ثقافت کے معاملے میں کنفیوژن کا بھی پتہ چلتا ہے۔ضیاء الحق کا نصف سے زیادہ دور نظریاتی کنفیوژن اور کشمکش کا دور ہے۔اور باقی جو بچا وہ افغانستان میں روسی دراندازی کے خلاف نبرد آزمائی میں ضائع ہوگیا۔ان خطوط میں ہمیں وہی احمد بشیر دکھائی اور سنائی دیتا ہے جو ایک سچ لکھنے والے دبنگ اور بے نیاز صحافی کے طور پر آج بھی زندہ ہے۔ اپنے منہ بولے بیٹے ،احمد مجید کے نام خطوط میں انھوں نے پاکستان کی سیاست کے بارے میں اپنے مخصوص انداز نظر سے روشنی ڈالی ہے۔چند اقتباسات دیکھئے۔

'' مہاجروں کو ایم کیو ایم نہیں چھوڑنی چاہیئے۔مگر سیاست کے محور تبدیل کر لینے چاہئیں۔غالباً ایسا ہی ہوگا۔ملک زوال پذیر ہے اور ابھی اور گرے گا''(۲۱)

ایک خط میں کراچی کے حوالے سے اپنی یادیں اجالتے ہوئے کہتے ہیں۔

'' میں اشتیاق اظہر کے بارے میں حیران ہوتا ہوں وہ میرے ساتھ سندھ گورنمنٹ میں انفارمیشن افسر ہوتا تھا۔اردو اور انگریزی دونوں سے نابلد تھا۔ لیکن اب کیسا سیاستدان بن گیا ہے۔اس کا کام میں کر کے دیا کرتا تھا۔اس کا مطلب ہے کہ آج کے دور میں سیاستدان ہونے کے لیے جھوٹا ،غبی اور سازشی ہونا ضروری ہے یہ بھی ضروری ہے کہ دوسروں سے اپنا کام کروا سکے۔''(۲۲)

وہ ایک محب وطن پاکستانی تھے اور جہاں معاملہ پاکستان یا پاکستانیت کا ہوتا وہاں احمد بشیر ایک الگ شخصیت کے طور پر نمودار ہوتے۔اس سلسلے میں ان کا ایک خط ملاحظہ کیجئے جو انھوں نے ارشاد احمد حقانی کے کسی کالم کے جواب میں لکھا۔اس خط میں انھوں نے معلوم حقائق کی نشاندہی کی ہے۔اس تحریر کے مندرجات سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ پاکستان کے بارے میں غلط بات سن ہی نہیں سکتے تھے۔(۲۳)

''پیرومرشد'' آج جب آپ نے خواتین کے جلسے میں منظور کی ہوئی قرارداد پر تبصرہ کیا تو میں نے سوچا کہ تصویر کے دوسرے رخ کے بارے میں جو کچھ مجھے اسلم اظہر ،نسرین اظہر ،مرزا فوٹوگرافر آغا ناصر کو اور چند اور لوگوں کو معلوم ہے وہ بھی بتادوں۔قرارداد میں کہا گیا ہے کہ پاکستانی فوج نے بنگلہ دیش میں کارروائی کے دوران عورتوں کی بے حرمتی اور زنا بالجبر کو بطور جنگی ہتھیار استعمال کیا۔ہماری بنگالی بہنوں کی بے شک بے حرمتی کی گئی اور ان کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا مگر یہ افسروں اور جوانوں کی انفرادی بدکرداری تھی۔جنرل ہیڈ کوارٹر سے اس قسم کا

کوئی حکم صادر نہ ہوا تھا پھر بھی ہم اس بات پر بہت شرمندہ ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جرم و گناہ کی اس فضا میں بہت کم جوان اور افسر ملوث ہوئے بلکہ بعض نے سخت احتجاج کیا اور کم از کم ایک افسر کرنل نادر خان جو ماشاء اللہ حیات ہیں اور عسکری فلیٹس میں رہتے ہیں شدت غم سے پاگل ہو گئے اور ایک عرصہ زیر علاج رہے۔ مگر بتانے کی بات یہ ہے کہ ٹائیگر صدیقی اور مکتی باہنی اور دیگر کئی باہنیوں کے رضا کاروں نے جو کچھ کیا اس کا بہت سا حصہ فلم پر ریکارڈ ہے۔ یہ لوگ جب قتل عام کرتے تھے یا مغربی پاکستان کی عورتوں کی بے حرمتی کرتے تھے تو وزنیوز (Viznews) اور دیگر غیر ملکی کیمرہ ٹیموں کو بلا لیتے تھے، یہ تصویریں دنیا بھر میں چل چکی ہیں۔ غالباً مئی 1971ء میں مغربی پاکستان کی مرد عورتوں کا قتل عام اور بے حرمتی ہوئی تو فوج نے صورتحال کو سنبھالنے کے بعد ٹی وی سے کہا کہ جو نشانات باقی ہیں ان کو فلم پر ریکارڈ کر لیں۔ ٹی وی کے انچارج اس زمانے میں اسلم اظہر تھے وہ کوئی ہفتے بھر کے بعد مشرقی پاکستان پہنچے جہاں ابھی فرش خون سے رنگین تھے، لاشوں کو گھسیٹنے کے نشانات موجود تھے۔ کنویں مُردوں سے اٹے پڑے تھے اور ایک پوری بستی کے مکینوں کو جن کے گلوں میں حمائل شریف کے جزدان لٹک رہے تھے، تلواروں اور خنجروں سے مزے لے لے کر قتل کیا گیا تھا بعد میں کوؤں نے ان کی مردہ آنکھوں میں چونچیں ڈال ڈال کر گودا کھایا۔ اس منظر کا خیال آتا ہے تو اب بھی میری نیند اڑ جاتی ہے۔ یہ فلم وزنیوز اور دیگر غیر ملکی کیمرہ ٹیموں کے اصلی شاٹس اور اسلم اظہر کے بعد کے شوٹ کئے ہوئے مواد پر مشتمل ہے۔ یہ فلم ایک گھنٹے کی ہے اور پاکستان ٹیلی ویژن اسلام آباد کی لائبریری میں پڑی ہے۔ اسلم اظہر نے بعد میں اس عاجز سے کہا کہ:

The stench of death has settled down in my head.

''یعنی موت کی بدبو میرے دماغ میں جم کر بیٹھ گئی ہے۔ یہ فلم دکھائی نہیں جاتی کیونکہ ہم بنگلہ دیش سے اپنے تعلقات خراب کرنا نہیں چاہتے مگر حقانی صاحب آپ بہت بااثر بزرگ ہیں آپ یہ فلم یقیناً دیکھ سکتے ہیں جیسے کہ میں نے دیکھ لی۔'' جو کچھ ہوا غلط ہوا اور ہم سب کو اس پر شرمندہ ہونا چاہیے اور ''ہم'' میں

کوئی حکم صادر نہ ہوا تھا پھر بھی ہم اس بات پر بہت شرمندہ ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جرم و گناہ کی اس فضا میں بہت کم جوان اور افسر ملوث ہوئے بلکہ بعض نے سخت احتجاج کیا اور کم از کم ایک افسر کرنل نادر خان جو ماشاء اللہ حیات ہیں اور عسکری فلیٹس میں رہتے ہیں شدت غم سے پاگل ہو گئے اور ایک عرصہ زیر علاج رہے۔ مگر بتانے کی بات یہ ہے کہ ٹائیگر صدیقی اور مکتی باہنی اور دیگر کئی باہنیوں کے رضا کاروں نے جو کچھ کیا اس کا بہت سا حصہ فلم پر ریکارڈ ہے۔ یہ لوگ جب قتل عام کرتے تھے یا مغربی پاکستان کی عورتوں کی بے حرمتی کرتے تھے تو وزنیوز (Viznews) اور دیگر غیر ملکی کیمرہ ٹیموں کو بلا لیتے تھے، یہ تصویریں دنیا بھر میں چل چکی ہیں۔ غالباً مئی 1971ء میں مغربی پاکستان کی مرد عورتوں کا قتل عام اور بے حرمتی ہوئی تو فوج نے صورتحال کو سنبھالنے کے بعد ٹی وی سے کہا کہ جو نشانات باقی ہیں ان کو فلم پر ریکارڈ کر لیں۔ ٹی وی کے انچارج اس زمانے میں اسلم اظہر تھے وہ کوئی ہفتے بھر کے بعد مشرقی پاکستان پہنچے جہاں ابھی فرش خون سے رنگین تھے، لاشوں کو گھسیٹنے کے نشانات موجود تھے۔ کنویں مُردوں سے اٹے پڑے تھے اور ایک پوری بستی کے مکینوں کو جن کے گلوں میں حمائل شریف کے جزدان لٹک رہے تھے، تلواروں اور خنجروں سے مزے لے لے کر قتل کیا گیا تھا بعد میں کوؤں نے ان کی مردہ آنکھوں میں چونچیں ڈال ڈال کر گودا کھایا۔ اس منظر کا خیال آتا ہے تو اب بھی میری نیند اڑ جاتی ہے۔ یہ فلم وزنیوز اور دیگر غیر ملکی کیمرہ ٹیموں کے اصلی شاٹس اور اسلم اظہر کے بعد کے شوٹ کئے ہوئے مواد پر مشتمل ہے۔ یہ فلم ایک گھنٹے کی ہے اور پاکستان ٹیلی ویژن اسلام آباد کی لائبریری میں پڑی ہے۔ اسلم اظہر نے بعد میں اس عاجز سے کہا کہ:

The stench of death has settled down in my head.

''یعنی موت کی بد بو میرے دماغ میں جم کر بیٹھ گئی ہے۔ یہ فلم دکھائی نہیں جاتی کیونکہ ہم بنگلہ دیش سے اپنے تعلقات خراب کرنا نہیں چاہتے مگر حقانی صاحب آپ بہت بااثر بزرگ ہیں آپ یہ فلم یقیناً دیکھ سکتے ہیں جیسے کہ میں نے دیکھ لی۔'' جو کچھ ہوا غلط ہوا اور ہم سب کو اس پر شرمندہ ہونا چاہیے اور ''ہم'' میں

ہمارے بنگلہ دیشی بھائی بھی شامل ہیں۔عورتوں کے مذکورہ جلسے پر میں بہت
خوش ہوا مگر اسے پاکستان کو مختلف زاویوں سے گالیاں دینے کا فورم نہیں ہونا
چاہیے۔کیا ہندوستانی فوجی کشمیری عورتوں کو گینگ ریپ نہیں کر رہے ہیں مگر
کشمیر اور کشمیری عورتوں کا اس کئی روزہ کانفرنس میں نام تک نہیں آیا یہاں
ہندوستان اور پاکستان کے بہتر تعلقات کے سلسلے میں ہندوستان کی پسندیدہ
لائن تو ملی یعنی کشمیر کو چھوڑ دو آؤ گلے لگ جاؤ۔یہ لائن اپر مڈل کلاس خصوصاً آسودہ
حال خواتین میں بہت پاپولر ہو رہی ہے۔ہماری تنگ نظر ملائیت نے ان کے بی
جلائے اور زی ٹی وی کے کھلے گریبانوں نے ان کے من بھرمائے ورنہ کچھ ان کو
کشمیری خواتین کی اجتماعی عصمت دری کا بھی خیال آتا۔

ارشاد احمد حقانی کے نام اس کتاب کا طویل ترین خط (۲۴)۔ان کے اخباری مضامین اور
کالموں کے طرز نگارش اور انداز فکر کی یاد دلاتا ہے۔جس میں انھوں نے فاضل کالم نگار کی اپنے کالم میں
مارکسزم اور اسلام کے حوالے سے چھیڑی گئی بحث پر ایک طویل مضمون لکھا ہے جو ان کے گہرے سیاسی
تجزیے،تاریخی شعور اور آگہی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اس خط میں وہ ایک ماہر عمرانیات کے طور پر سامنے
آتے ہیں۔انھوں نے ازمنہ وسطی اور قرون اولی کے حوالوں سے اور اسلامی تاریخ کے اوراق سے اپنے
موقف کے بارے میں حوالے دیئے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے پاکستان کے حکمرانوں اور
سیاستدانوں کے طرز حکمرانی اور ان کے انداز و اطوار کا بلاامتیاز اور بلا لحاظ تذکرہ کیا ہے۔اور ان کے''
لچھنوں''اور''کرتوتوں'' کا برملا اظہار کیا ہے۔انھوں نے اسلام میں ملائیت کے پرچارکوں کی بھی اس
مکتوب میں خوب خبر لی ہے۔محدود صفحات کے باعث چند مختصر اقتباسات پیش کئے جارہے ہیں تاکہ
قاری کو ان کے جنون کی شورش کا اندازہ ہو سکے۔

''۔۔۔پہلے عربوں اور ایرانیوں پر یونانی فکر کا غلبہ تھا اور اس کی روشنی میں وہ
قرآن کی تفسیریں کرتے تھے۔یونانی فکر کے مطابق کائنات ایک مکمل شدہ اکائی
ہے جس میں نمو اور ارتقائے حیات کی کوئی گنجائش نہیں۔مسلمان فلسفیوں نے
قرآن کے معانی پر غور کیا تو ان پر کھلا کہ انسانوں میں ڈی این کا نقشہ رکھا گیا ہے
۔اس کے اور کائنات کے بارے میں ان کے تصورات بدل گئے اور انھوں نے
تجسس اور تحقیق شروع کر دی۔چنانچہ ساری بنیادی سائنس انھوں نے مرتب کی

۔ان سے غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے ملوکیت کے ادارے کو بھی پوچھنا شروع کر دیا کہ تم کس کھیت کی مولی ہو اور یہ تقدیر کیا چیز ہے۔؟ مامون الرشید کے زمانے تک تو ان پر خیر گزری، پھر مولوی اور جاگیر داران کے پیچھے پڑ گئے۔ انہیں چن چن کر قتل کیا گیا۔ ان کی کتابیں جلا دی گئیں اور اجتہاد کے تحقیقی فکرِ جدید کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا تا کہ کوئی نیا خیال مسلمانوں کے ذہن میں پیدا نہ ہو سکے اور وہ حال مست اور حکمران مال مست رہیں۔۔۔'' (۲۵)

اس خط میں ان کے مارکسی نظریات کی نہج کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان کا یہ خط ان کے سیاسی عقائد کے بارے میں کوئی ابہام نہیں رہنے دیتا۔ انھوں نے اس خط میں کمیونزم اور صاحب کمیونزم کی حیثیوں پر بڑی مدلل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ کارل مارکس نے قیامت تک کے مسائل حل کر دیئے ہیں۔ یہ تو سخت غیر مارکسی بات ہوتی۔ کیونکہ انسانی معاشرہ مسلسل ارتقا پذیر ہے اور اس میں نت نئے حالات اور مسائل پیدا ہوتے رہیں گے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر میں کیسے کہہ سکتا تھا کہ کارل مارکس نے تمام سوالات کے جواب ابدی طور پر دے دیئے ہیں۔'' (۲۶)

آگے چل کر اسی خط میں لکھتے ہیں۔

'' چونکہ روس میں سوشلزم ناکام ہو چکا ہے۔ اس سے کارل مارکس کا فلسفۂ تاریخ غلط ثابت ہوا۔۔ جناب والا! یہ ایک بودی اور خطرناک دلیل ہے کیونکہ مارکسی فلسفہ تاریخ اور روس کا زوال دو مختلف معاملات ہیں ۔۔۔ خطرناک اس لیے کہ کہا جاتا ہے کہ اسلام جو ایک الہامی دین ہے خلفائے راشدین کے چودہ سو سال بعد تک کسی مثالی اور مکمل نظام حکومت میں نہیں ڈھل سکا۔ اس لیے اسلام ہی باطل ہے۔ یہ ایک واہیات استدلال ہے۔ سوشلزم کو تو صرف ستر برس ملے اور ابھی تاریخ انساں اپنی انتہا کو نہیں پہنچی، آگے دیکھیے ابھی تو سرمایہ داری نظام کو اپنی تخلیقی قوت کے کمال کو پہنچنا ہے۔ اس کے بعد سوشلزم کی کی آزمائش ہوگی۔۔۔'' (۲۷)

گذشتہ دہائیوں میں پاکستان میں سوشلزم اور کمیونزم کے خلاف شدید ردِعمل اور بالشویک

حکماء کے خلاف شدید نفرت نے پاکستان میں، آگے چل کر مذہبی انتہا پسندی کو جنم دیا۔ معدودے چند دانشوروں نے عوام کی سوچ اور فکر میں توازن پیدا کرنے کی کوششیں کیں۔ ان میں سب سے توانا آواز احمد بشیر کی ہے۔ اسی خط سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

''۔۔۔ مارکس کو گالی دینے سے ہمارا مسئلہ حل نہیں ہوتا اسے قبر سے نکال کر پھانسی پر لٹکا دیجئے۔ مجھے کیا لینا دینا وہ ایک مفکر تھا۔ جس نے تاریخ کے گہرے مطالعے کے بعد اس کے عمل کے کچھ اصول وضع کیے ہیں۔ اسی لیے اقبال نے اس کے بارے میں کہا تھا: 'نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب' اقبال نے تو یہ بھی کہا تھا۔ تھا کہ مارکسزم جمع خدا برابر ہے اسلام۔ اگر آپ سوشلسٹ ہیں تو آپ کے نماز روزے پر کوئی پابندی نہیں۔ آپ صدقہ خیرات بھی دیجئے۔ زکوۃ بھی ادا کیجئے۔ آپ کو سوشلزم کسی نیکی سے نہیں روکتا۔ مگر وہ یہ نہیں کہتا کہ پتہ بھی نہیں ہلتا بغیر اس کی رضا کے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ پتا ہلتا ہے تو اس کے لیے ہوا کو چلایا جاتا ہے اور اسلام بھی یہی کہتا ہے۔ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی۔ مطلب یہ ہے کہ مادے کی حرکت کا دارومدار مادی قوت پر ہے جو مادے کے اندر جدلیات کی صورت میں رکھ دی گئی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ اسلام کے حسین چہرے پر ملوکیت کی جو گرد جم چکی ہے۔ اس کو جدید فکر کے صابن سے دھو کر صاف کرو۔ صرف عقیدے کو لے کر بیٹھنے سے نشہ تو ہوگا مگر ترقی کرنے کے لیے پیر ہلانے پڑیں گے۔''(۲۸)

ان کے خطوط سے ان کے آدرشوں کے ساتھ ساتھ زمانی اعتبار سے ان کے حالات اور ان کی طبیعت پر ان کے اثرات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ پہلے باب میں یہ بات بیان میں آچکی ہے کہ انھوں نے اپنی فلم ''نیلا پربت'' کے دوران بہت مشکل حالات دیکھے جنہوں نے انہیں جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اپنے منہ بولے بیٹے کے نام مکتوب کے اس اقتباس میں اس کی باس محسوس کیجئے:

''بعض لوگ پیدا ہی اس لیے ہوتے ہیں کہ پھانسی چڑھائے جائیں۔ راستے کے پتھر توڑیں، پانی کے چشمے ڈھونڈیں پہاڑوں کی بلندیاں ناپیں۔ یہ لوگ بہت ہی مظلوم، دکھی مصیبت زدہ اور ہمیشہ اکیلے ہوتے ہیں۔ جب وہ مر جاتے ہیں تو کوئی نہیں جانتا کہ ان کی لاشیں کس صحرا میں سڑ گئیں۔ لیکن عالم میں نور

انہی کے دم سے پھیلتا ہے۔ بستیاں وہی بساتے ہیں۔ راستے وہی بناتے ہیں۔
ان لوگوں کو اسی لیے پیدا کیا گیا ہے ان کا یہی مقصد ہے۔ اگر فلم ریلیز ہو گئی تو
شاید ان گلی سڑی لاشوں میں میرا نام بھی لکھا جائے۔ ورنہ ریت میں ہزاروں
ذرے گم ہو گئے میں اپنی مصیبتوں کا عادی ہوں اور غصے اور بے چینی سے رنجور
نہیں ہوتا۔ البتہ میری حیرت میں اضافہ ضرور ہوتا چلا جاتا ہے۔''(۲۹)

یہ خط وفات سے کئی سال پہلے جب ان کی فلم نیلا پربت نے انہیں پریشان کر رکھا تھا تب کا
لکھا ہوا ہے۔ جو ان کے آدرشوں کا آئینہ دار ہے۔ اس میں ایک سفرنامے میں مسافر کے تاثرات کی باس
پائی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے ذہنی افق اور غور و فکر کر کے اپنے افکار کی تزئین و آرائش اور
اپنی سوچ کی سچائی پر دلیل پانے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان کے خطوط ان کے آدرشوں اور افکار کے آئینے
ہونے کے ساتھ ان کے فکری ارتقا کی داستان سناتے ہیں۔ ذاتی حوالوں کے علاوہ جو خطوط لکھے گئے ان
میں جمیل الدین عالی، ارشاد احمد حقانی، مشفق خواجہ، افتخار عارف کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ وہ ہر خط
میں اپنے منہ بولے بیٹے کے لیے محبت کی وہ بارش برساتا ہے کہ پڑھنے والا بھی اس کی پھوار میں بھیگ
جاتا ہے۔ ہر خط کا آغاز۔ پیارے بیٹے مجید اور اختتام۔ تمہارا پیار کرنے والا ابا۔ پر ہوتا ہے۔ البتہ کہیں
کہیں بعض خطوں میں بھی ان کا لہجہ ان کے مضامین اور خاکوں کی یاد دلاتا ہے۔ احمد بشیر کے خطوط ہی
سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف ہومیو پیتھک طریقۂ علاج سے شدھ بدھ رکھتے تھے۔ بلکہ ان کا اس طریقۂ
علاج پر اعتقاد بھی تھا۔ اپنے کئی مکاتیب البیان کو ہومیو پیتھک اور بائیو کیمک ادویہ کے استعمال کے
مشورے بھی دیئے ہیں۔ انہی خطوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ خود بھی ان ادویہ کا باقاعدگی سے
استعمال کرتے تھے۔ علاوہ ازیں علم نجوم، تعویذوں کے رد بلا ہونے پر بھی ان کا اعتقاد ظاہر ہوتا ہے۔(
قلزم عرف مانو کو خط میں لکھتے ہیں: تمہارے لیے ضروری ہے کہ اس تعویذ کو سنبھال کر رکھنا۔ سب
برکتیں خدا سے آتی ہیں مگر اس کے کلام کی تاثیر بھی ہے۔ اس میں تمہارے لیے میں نے تین چیزیں مانگی
ہیں۔۔۔(۳۰) احمد بشیر کی شخصیت زیادہ پرپیچ لگنے لگتی ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک طرف وہ اپنے خطوں میں اللہ
پر عقلی بنیادوں پر ایمان لانے کی بات کرتے ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ اور مشاہیر اسلام سے ان کی کسی
جذباتی وابستگی کا اظہار ان کی کسی تحریر سے نہیں ملتا۔ بلکہ وہ ان کی ذاتی خوبیوں اور انسانی فلاح کے لیے
کارہائے نمایاں انجام دینے پر ان کے قائل اور معترف ہیں۔ وہ تقدیر پر کسی حد تک بھی تکیہ کرنے کے
قائل نہیں نظر آتے ہیں۔ مگر وہ تعویذ دھاگوں میں بھی شفا کے موتی ڈھونڈتے ہیں۔ دوسری طرف وہ

اپنے بیٹے کو خط میں لکھتے ہیں:۔

''خدا کے جاننے کے لیے خدا کو ماننا ضروری ہے مگر مجھے اصول حرکت کائنات کی سائنس کا علم ہے اس لیے میں اس خدا کو نہیں مانتا جو ایک پاگل اور بے اصول شہنشاہ کی کرسی پر بیٹھا ہے۔ دعا مانگنے سے اس کا دل پسیج جاتا ہے اور گالی دو تو اسے غصہ آتا ہے۔ یعنی وہ ایک جذباتی ہستی ہے۔ کمزور ہستی ہے۔ قادر مطلق نہیں۔ آپ اپنے قول و فعل کی ذمہ داری سے بچ جاتے ہیں کیونکہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ مگر ہم لوگ جن میں جرأت تحقیق ہے بہت دشوار زندگی گزارتے ہیں۔ کیونکہ ہم اپنے قول و فعل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔(۳۱)

ایک خط میں ماہر لسانیات کے طور پر ان کا قلم یوں چلتا ہے۔

''بات کو سمجھنے کے لیے سوال اٹھانے چاہئیں۔ بحث برائے تضیع اوقات ہے ۔کشٹ کا لفظ سنسکرت سے آیا مگر اردو میں شامل ہو گیا۔ جو تم نے نہیں پڑھی ۔اسارنا ایک پنجابی لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے کسی بات، خیال کا عمارت کو بنیاد سے اٹھا کر شکل دیتے چلے جانا۔ اردو میں اس کا متبادل نہیں، اس لیے اسے پنجابی اردو لکھنے والوں نے اردو میں شامل کر لیا۔ اردو کا اپنا کوئی لفظ نہیں۔ سب لفظیات ادھر ادھر سے آئیں اور مستعمل ہو گئیں۔ یہی زبانوں کی زندگی کا اصول ہے۔ بہت سے ایسے الفاظ بھی لوگ استعمال کر جاتے ہیں مگر چوں کہ سب کو قبول نہیں ہوتے، اس لیے متروک ہو جاتے ہیں۔ ایسے ثقہ الفاظ بھی متروک ہو جاتے ہیں جن کی ضرورت ختم ہو چکی ہے۔''(۳۲)

حافظ محمود شیرانی اور دیگر زعمائے لسانیات کی طرح احمد بشیر بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اردو کی نہ صرف تشکیل اور تخلیق بلکہ اس کی تزئین و تہذیب میں بھی سب سے زیادہ حصہ اہل پنجاب کا ہے۔ اس حقیقت کے دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے متعدد خطوط میں اہل پنجاب کی خدمات کا ذکر بڑے فخر سے اور اس کے باعث جوان کے اپنی ماں بولی کے ساتھ سلوک ہے کا ذکر بڑے تأسف کے ساتھ کیا ہے۔

''ساری ترقی پسند تحریک گواہ ہے کہ جو اردو انیس سو سینتالیس میں رائج تھی اب اس کا لہجہ اور خزینہ الفاظ پنجابیوں نے بدل دیا۔ اس میں سے شوکت الفاظ، رنگین بیانی اور تشبیہ و استعارہ، محاورے کٹ گئے اور نئے سماجی تجربے داخل ہو

گئے۔ بتاؤ کراچی کے مہاجروں نے اردو کو کیا دیا۔؟''(۳۳)

احمد مجید کے نام لکھے گئے ان کے خطوط ۔۔۔۔احمد بشیر سے پوری ملاقات کا ذریعہ ہیں۔ کیونکہ یہ کسی ایک موضوع پر بند نہیں۔ فلم سیاست، ادب، صحافت، ہر موضوع پر ان کے خطوط بولتے اور اپنے قاری سے باتیں کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ کیونکہ عام طور پر تقریر کے برعکس تحریر میں جس حزم و حجاب یا خاطرداری ملحوظ خاطر رکھی جاتی ہے۔ احمد بشیر کے ہاں ہمیں اس کا اہتمام نہیں ملتا۔ انھیں کوائف و خصائل کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ احمد بشیر کے خطوط ان کے اس دنیا میں عدم موجودگی میں ان سے پوری ملاقات کا ذریعہ ہیں۔ مکاتیب کے باب میں یہ بات بہت اہم ہے کہ یہ کسی شخصیت اور اس کے عہد کے مزاج کے مرموز ہوتے ہیں۔ کیونکہ شخصیتِ مذکور کی دیگر اصناف، خاص طور پر اصنافِ نثر میں طبع آزمائی میں آمد اور آورد دونوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ جس سے اس کی فنی مہارت اور امتیاز کا تو بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے مگر جہاں تک اس کی شخصیت کا زندگی میں اس کے برتاؤ کا تعلق ہے ا۔ مکاتیب، اس کا سراغ لگانے کا بہترین ذریعہ ہوتے ہیں۔ احمد بشیر کی شخصیت کی جو پرتیں ان کی تحریر میں مخفی ہیں وہ ان کے مکاتیب میں ہویدا ہوتی نظر آتی ہیں۔ ان مکاتیب میں وہ ایک دوست، باپ اور ایک وطن دوست شہری کے طور پر جلوہ گر ہیں۔ ان خطوط میں ان کی دیگر تحریروں کی نسبت واقعیت زیادہ ہے۔ جذباتیت کی لہریں بین السطور سفر کرتی ہیں مگر خطوط میں ان کا لہجہ خاصا سنجیدہ ہے۔ اولاد، دامادوں اور ذاتی دوستوں کو لکھے گئے۔ خطوط محبت کی چاشنی اور اپنائیت کے شہد سے معمور ہیں۔ خاص طور پر اپنی بیٹیوں اور بیٹے کو لکھے گئے خطوط میں تو لفظ لفظ سے شفقت کی پھوہاریں پھوٹتی ہیں۔ دوستوں میں سب سے زیادہ خطوط ممتاز مفتی کے نام ہیں۔ یہ خطوط زندگی کے مختلف ادوار میں لکھے گئے۔ جن میں ان کی سرگرمیوں اور ان کے مشاغل کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی عہد بہ عہد اگر ان کی مصروفیات کا روزنامچہ تیار کیا جائے تو اس میں یہ خطوط بنیادی مآخذ کی حیثیت کے حامل ہیں۔ دوستوں کے نام لکھے گئے مکاتیب میں وہ ایک خیال رکھنے والا دوستوں کے مسائل اور مجبوریوں کا احساس کر کے انہیں رعایتی نمبر دینے والا اور ان کی صحت اور تندرستی کے لیے فکر مند ہونے والا ایسا دوست بن کر سامنے آتا ہے جو کسی غیر مترقبہ نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ ان کے منہ بولے بیٹے مجید اور داماد عباس کے نام لکھے ہوئے خطوط ایک نئے احمد بشیر کا تعارف کرواتے ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ معاشی انصاف کے لیے سچی بات کہنے کے لیے ہر مصلحت کو بالائے تاک رکھ کر رزم حق و باطل میں فولاد کی طرح سخت احمد بشیر حلقہء یاراں میں ابریشم کی طرح نرم اور محبت کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔

حواشی وحوالہ جات اور توضیحات

۱۔خطوں میں خوشبو۔ص:۹

۲۔ایضاً۔ص:۱۳،۱۴

۳۔احمد بشیر کے بعض دوستوں اور رشتہ داروں کے نام بھی ہیں۔اس کے علاوہ بھی وہ مختلف لوگوں سے رابطے کر رہی ہیں کہ اگر احمد بشیر کے خطوط ان کے پاس ہوں تو وہ ان سب کو یکجا کر کے کتابی شکل میں منظر عام پر لا سکیں۔اس مقصد کے لئے ان کا خیال ہے کہ وہ جلدی بذریعہ کسی اخبار یا سوشل میڈیا پر احمد بشیر کے دوستوں اور ان کے مداحوں سے درخواست کریں گی کہ اگر ان کے پاس کچھ خطوط ہوں تو مؤلفہ کو ارسال کر دیں (مصاحبہ: نیلم احمد بشیر)

۴۔بحوالہ،تعارف از مؤلفہ:نیلم احمد بشیر،مشمولہ،خطوں میں خوشبو۔ص:۷

۵۔خطوں میں خوشبو۔ص:۱۳

۶۔ایضاً۔ص:۱۴

۷۔ایضاً۔ص:۱۷،۱۸

۸۔ایضاً۔ص:۳۱

۹۔ایضاً۔ص:۸۱

۱۰۔ایضاً۔ص:۸۲

۱۱۔ایضاً۔ص:۸۴

۱۲۔ایضاً۔ص:۹۷

۱۳۔ایضاً۔ص:۹۸،۹۹

۱۴۔ایضاً۔ص:۹۱

۱۵۔ایضاً۔ص:۸۵

۱۶۔ایضاً۔ص:۹۴

۱۷۔ایضاً۔صص:۹۵،۹۶

۱۸۔ایضاً۔صص:۱۱۵۔۱۱۷

۱۹۔ایضاً۔ص:۱۱۸

۲۰۔ایضاً۔ص:۱۲۰

۲۱۔ایضاً۔ص:۱۷۲

۲۲۔ایضاً۔ص:۱۷۴

۲۳۔حرف تمنا، کالم، مطبوعہ روزنامہ جنگ، فروری ۲۰۰۲

۲۴۔خطوں میں خوشبو۔ص:۱۴۷

۲۵۔ایضاً۔ص:۱۵۰

۲۶۔ایضاً۔ص:۱۵۲

۲۷۔ایضاً۔ص:۱۶۳

۲۸۔ایضاً۔ص:۱۵۲،۱۵۳

۲۹۔ایضاً۔ص:۱۷۱

۳۰۔ایضاً۔ص:۱۰۶

۳۱۔ایضاً۔ص:۲۰۹

۳۲۔ایضاً۔صص:۱۷۶،۱۷۷

۳۳۔ایضاً۔ص:۱۷۷

باب۔(۲):

احمد بشیر: مجموعی جائزہ (فکروفن)

احمد بشیر (مجموعی جائزہ)

ان کی تحریریں اپنے قاری کو ایک طرف احوال واقعی کی مختلف پرتیں کھول کر دکھاتی ہیں تو دوسری طرف دعوت غور وفکر بھی دیتی ہیں۔ان کا خیال ہے کہ ایوب خاں سے لے کر آج تک جتنے بھی حکمران آئے ان کی شخصیت انقلابی نہیں بلکہ کرشماتی تھی۔جمہوریت کا دعویٰ کرنے اور جمہوریت کے ذریعے برسر اقتدار آنے والوں نے اپنی جماعتوں کو کبھی سیاسی طور پر منظم نہیں کیا۔کسی نے اپنی جماعت کے اندر جمہوری طرز عمل اختیار نہیں کیا۔الیکشن نہیں کروائے۔ان کرشماتی کردار کے حامل لیڈروں میں یہ رسم چلی آرہی ہے کہ وہ اپنی سنٹرل کمیٹی نامزد کرتے ہیں۔پھر یہی کمیٹی انہیں تاحیات پارٹی کا چیئرپرسن منتخب کر لیتی ہے۔بعض لوگوں کا خیال تھا کہ احمد بشیر بائیں بازو کے دوسرے دانشوروں کی طرح پیپلز پارٹی اور اس کی پالیسیوں سے جیالی ایسی وابستگی رکھتے ہیں۔ان کا قلم جسے سچ سمجھتا ہے اسے لکھنے میں ذرا نہیں ہچکچاتا۔وہ اگر بھٹو کے بارے میں اپنے اندر نرم گوشہ رکھتے تھے تو ان کی غلطیوں پر تنقید بھی کرتے تھے۔انھوں نے پاکستان کے کسی بھی سیاسی راہنما یا حکمران کے کسی بھی عمل پر جانبداری اور مصلحت سے کام نہیں لیا۔

احمد بشیر کا خیال ہے کہ پاکستان کا مسئلہ جمہوریت نہیں، فیوڈل کلچر ہے جس کے معنی ہیں حرام کی کمائی کا کلچر۔اپنی اس بات کی وضاحت انھوں نے بڑے دلچسپ انداز میں کی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اس لحاظ سے ذہنی طور پر ہمارا قلی اور چپراسی بھی فیوڈل ہے۔وہ بھی چاہتا ہے کہ کام کیے بغیر ہی تنخواہ مل جائے اور ان کی بنیاد ہمارا زمیندارانہ نظام ہے۔ان کے ہاں ملک کے احوال پر سیر حاصل بحث ملتی ہے۔پاکستان کے عوام جو آئے روز ،آئین اور قانون کی حکمرانی کے بارے میں بیان سنتے رہتے ہیں ،سر دھنتے رہتے ہیں۔ان کا موقف ہے کہ پاکستان میں کبھی کوئی کوئی تبدیلی آئی تو کانسٹی ٹیوشن کی خلاف ورزی کر کے ہی آئے گی۔باقی سب بکواس ہے اور ہیومن رائٹس میں روٹی کپڑا مکان، تعلیم اور علاج شامل نہیں۔یہ ایک فراڈ ہے جس کا مقصد طبقاتی تضاد سے توجہ ہٹانا ہے ظلم کا خاتمہ کرنا نہیں۔ان تلخ

حقائق کی روشنی میں ان کا کہنا ہے کہ آئین ایک ایسی دستاویز ہے جس نے پاکستان کے طبقاتی کردار کو دوام بخشا۔اس کی روشنی میں اقتدار ہمیشہ مالدار طبقوں میں گردش کرتا رہتا ہے۔جن کا کلچر فیوڈل ہے اور تقلید پسندانہ ہے۔ان کے زیر تذکرہ کتاب میں شامل مضامین کے موضوعات ہر پھر کر پاکستان کی سیاست اور اس کے سیاسی بزرگوں کی فکری دھاندلیوں،اور پاکستان کی اساس اور اس کے قیام کے نظریئے پر ہی ارتکاز کرتے ہیں۔ان کے مضامین کا ملخص مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ پاکستان کا قیام سیکولر (لادینی نہیں) بنیادوں پر عمل میں آیا۔جسے جاگیردار اور سرمایہ دار طبقے نے اپنی جاگیریں بچانے کے لیے اسلام کے نظریئے سے وابستہ کر دیا۔

۲۔ مرئی تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی، چنانچہ نظریہ پاکستان کا راگ الاپنے اور دستور کے مطابق جمہوی نظام کی رٹ عوام کو خوشحالی کے خواب دکھانے کے مترادف ہے۔دراصل اس خرابی کو دور کرنا ہوگا جو کہ پاکستان میں کسی بھی ایسے نظام کو جڑ نہیں پکڑنے دیتی جو سماجی انصاف کا ضامن ہو۔

۳۔ احمد بشیر قائداعظم کے تدبر اور فراست اور اخلاص کے معتقد ہیں۔ان کا خیال ہے کہ قائد کے پاکستان کو جاگیرداروں نے مذہب کے نام پر ہائی جیک کر لیا۔گویا۔منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔انہیں اس بات کا شدید ملال ہے کہ،منزل انہی ملی جو شریک سفر نہ تھے۔

۴۔ وہ پاکستان میں مذہب اور سیاست کو الگ الگ کرنے کے خواہشمند ہیں۔ہر چند کہ وہ علامہ اقبال کے شیدائی اور ان کی فکر کے خوشہ چین ہیں۔انھوں نے پاکستان کی سیاسی بیماریوں کے لیے کمیونزم اور سائنٹفک سوشلزم کو علاج تجویز کیا ہے۔

۵۔ پاکستان میں عام طور پر سوشلسٹ اور کمیونسٹ مردود اور قابل گردن زدنی قرار دیئے گئے۔یہ دراصل مذہبی جماعتوں اور سامراجی گماشتوں کی سازش تھی۔مگر اس ''مردود طبقے'' نے بھی اپنی تحریروں اور تقریروں میں استدلال کے بغیر مذہب سے اختلاف اور مذہبی امور سے خدا واسطے کی بیزاری اور برأت کے بھونڈے طریقوں اور جاگیرداری سوچ کو مذہب سے وابستہ کرنے جیسے بہتانوں نے عوام میں سامراجی طاقتوں کے اس پراپیگنڈے کی کامیابی میں بہت مدد کی کہ کمیونسٹ پارٹی برگشتۂ اسلام گروہ کا نام ہے مگر احمد بشیر کی کسی بھی تحریر میں قرآن، حدیث، فقہ اور اسلامی فلسفۂ حیات کے بارے میں مبتذل لہجہ نہیں ملتا۔وہ بڑے

استدلال سے مقصود فطرت اور رمزِ مسلمانی کے اسرار و رموز پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔انھوں نے خود کو سوشلسٹ کہتے ہوئے کہیں بھی اسلام اور فکرِ اسلام سے بے تعلق ہونے کا اعلان نہیں کیا۔

۶۔ ان کا قلم دائیں اور بائیں بازو کی غلط کاریوں اور کج فہمی پر برابر نشانہ لگاتا ہے۔اس سلسلے میں حمید اختر کے ساتھ ان کی خط و کتابت ثبوت کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔

ان کے مضامین کے مطالعے کے بعد ان کی فکر کے چراغ قاری پر اس طرح روشن ہو جاتے ہیں کہ ان کی فکر میں کوئی ابہام نہیں رہتا۔آپ ان کے مضامین کے مندرجات سے اپنے عقائد، نظریات اور پسند کی روشنی میں اختلاف کر سکتے ہیں مگر ان کا استدلال آپ کو ان کے نقطۂ نظر پر غور کرنے کے لیے ایک بار ضرور اکساتا ہے۔خاص طور پر پاکستان کے قیام اور اسلام کے نظریۂ ریاست کے بارے میں ان کا استدلال بہت ہوشمندانہ اور کسی قسم کی جذباتیت سے پاک ہے۔''خرابیاں نہیں غلطیاں گنواؤ'' میں ان کا اندازِ تکلم ملاحظہ ہو۔(کالم مورخہ ستمبر ۲۰۰۰ مشمولہ خونِ جگر)

''پاکستان ایک جمہوری سیکولر اور ماڈرن ریاست کے طور پر بنا تھا جس میں سب شہری حقوق و فرائض کے معاملے میں برابر ہوتے مگر تھیوکریسی کے خلاف قائدِ اعظم نے کھل کر کہا۔ایک جگہ 'مذہب کا امورِ ریاست سے کوئی تعلق نہ ہوگا' اور دوسری جگہ 'پاکستان ایسی ریاست نہیں ہوگی جس پر خدائی مشن کے نام پر پادری راج کریں'۔۔کیا کسی نے سچ بولنے کی جرأت کی؟ سیکولر کا مطلب لادین حکومت نہیں بلکہ ایک ایسی ریاست ہے جس میں دین اور ریاست کا آپس میں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا اور یہ دونوں ادارے اپنے اپنے عمل میں آزاد ہوتے ہیں۔مگر ہمارے ہاں سیکولر کے معنی لادینی کے ہیں۔۔''

اور اسلام کی نظریاتی ریاست پر ان کا اندازِ تحریر ملاحظہ کیجئے:

''اگر ریاستِ مدینہ کو اسلامی ریاست کا نمونہ سمجھا جائے تو یہ ریاست اپنے سیاسی کردار میں سیکولر تھی۔(بحوالہ میثاقِ مدینہ) اس میں مسلمانوں اور معاہد غیر مسلموں کو ''امتِ واحدہ'' قرار دیا گیا۔اور اس پر سرورِ کائنات کی مہر ثبت ہے۔''

احمد بشیر کی صحافت کا زمانہ، برِ عظیم پاک و ہند کی سماجی اور سیاسی کروٹوں کا زمانہ ہے۔جب سرکارِ برطانیہ کا پھریرا بحرِ ہند سے لے کر درۂ خیبر تک لہرا رہا تھا۔اور ہندوستان کے لوگ انگریز سے

آزادی کے لیے برسر پیکار تھے۔ عالمی سطح پر ہونے والی دونوں جنگوں نے عالمی استعمار کو اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ دنیا کا معتد بہ حصہ صدیوں پرانے فرسودہ اور مکروسرمایہ دارانہ طرزِ معیشت اور معاشرت سے بغاوت کر کے اشتراکی نظام کی طرف نہ صرف بڑھ رہا تھا بلکہ روس نے وسطی ایشیائی ریاستوں کو ساتھ ملا کر سوویت یونین کے نام سے ایک عظیم اشتراکی وحدت بنا کر مارکس کے نظریہ معیشت کو قابل عمل کر دکھایا تھا۔ ادھر چین میں بھی ماؤ کا سوشلسٹ انقلاب آنے کے لیے چھانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ دریں احوال، ہندوستان کا نوجوان اور پڑھا لکھا طبقہ، جس نے غلامی میں آنکھ کھولی تھی۔ وہ اپنی جاتی ہوئی نسل سے شدید شاکی تھا۔ دراصل اس نسل کو جس نے زندگی کی منازل انگریز کی صدی بھر کی غلامی میں زندگی کے مراحل طے کئے تھے۔ وہ نفسیاتی سطح پر انگریز کی برتری کے آگے ہتھیار ڈال چکی تھی۔ اسی نسل کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا۔ جس نے انگریز کی غلامی میں تو آنکھ کھولی مگر اس کے اندر انگریز سے نفرت اور اپنے اسلاف اور ہندوستان کے بادشاہی نظام سے دلی وابستگی کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ چنانچہ انہیں انگریزی تہذیب اور انگریز سے شدید نفرت تھی۔ وہ اسی فکر کے احیاء میں پیش پیش تھے۔ جس طرزِ فکر نے آج ہندوستان کے کروڑوں باشندوں کو سمندر پار سے آنے والے سوداگروں کے ہاتھ رہن رکھ دیا تھا۔ وہ آج بھی بادشاہ کے گن گاتے تھے۔ اپنے اسلاف کا کلمہ پڑھتے تھے ا۔ 'پدرم سلطان بود' کی افیون نے انہیں مست الست کر رکھا تھا۔ وہ زندگی کی دوڑ میں کسی طرح بھی یورپی اقوام کے تبحر علمی سے مستفیض ہونے پر تیار نہ تھے۔ یہ طبقہ عام طور مسلمان اکثریت پر مشتمل تھا۔ کیونکہ انگریز نے حکومت مسلمان بادشاہوں سے چھینی تھی۔ وہ انگریز کو غاصب خیال کرتے تھے۔ ادھر انگریز نے بھی مسلمان قوم کے ساتھ امتیازی سلوک کر کے ان کے خیال کو ان کا ایمان بنا دیا تھا۔ ایسے میں ایک تیسرا طبقہ پیدا ہوتا ہے۔ جس نے حالات کا غائر مطالعہ کیا اور دو نتہاؤں پر متمکن ان طبقات کے افکار کی تطہیر اور تہذیب کی۔ اس طبقے نے انگریز کی حسنات سے اکتساب اور سیات سے اجتناب کے رویے کو فروغ دیا۔ ایک طرف، دو انتہاؤں میں بٹے ہوئے ہندوستانیوں کے درمیان فاصلے کم کرنے اور دوسری طرف ۔نئی اور پرانی نسل کے درمیان فکری بُعد (generation gape) جو خطرناک حد تک بڑھ چکا تھا ،اسے کم کرنے کے سلسلے میں اس طبقے کی مساعی آب زر یں سے لکھنے کے قابل ہیں۔ چنانچہ اس طبقے نے جس نسل کو جنم دیا اور پروان چڑھایا وہی آگے چل کر ہندوستان میں سیاسی اور سماجی سطح پر تبدیلیوں کا ذریعہ بنی۔ اس میں انگریز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا یارا تھا۔ علی برادران، قائداعظم ،گاندھی، ،نہرو، اقبال، ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، وغیرہم کا تعلق اسی نسل سے تھا۔ اور اسی نسل کی

دریوزہ گری سے پروان چڑھنے والی نسل کا عہد احمد بشیر کا عہد ہے۔ جب انھوں نے صحافت شروع کی تو ان کے پیش نظر، شعوری یا لاشعوری طور پر یہی نسل تھی۔ ان کے سامنے صحافت کے میدان میں مولانا ظفر علی خاں اور محمد علی جوہر جیسے نابغہ ہائے روزگار کے نظائر موجود تھے۔ اس پر طرہ مولانا چراغ حسن حسرت کی صحبت غیر مترقبہ کہ جو کم کم لوگوں کے حصے میں آئی۔ خود انھوں نے متعدد جگہوں پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے صحافت مولانا چراغ حسن حسرت سے سیکھی اور صحافت میں وہی ان کے استاد تھے۔ یہی وہ خواص تھے جن سے مل کر احمد بشیر کا صحافیانہ رنگ تشکیل پایا۔ ان کی تحریر کی بے باکی آج کے صحافیوں کے بجائے مذکورہ بالا نسل کے صحافیوں کی یاد دلاتی ہے۔

مجموئی طور پر ان کی پہلی کتاب ''خون جگر ہونے تک'' اور دوسری کتاب Dancing with wolves جو ان کے انگریزی مضامین اور کالموں کا مجموعہ ہے۔۔۔ کے مندرجات اور اس کے موضوعات میں ایک نامیاتی سا تعلق پایا جاتا ہے۔ البتہ کہیں کہیں ان کے افکار و واقعات کی تکرار کے باعث قاری کی توجہ زیر نظر مضمون کے اس حصے سے ہٹ جاتی ہے۔ جبکہ احمد بشیر اپنی اسی بات کو یا تجربے اور واقعے کو کسی نئے پہلو کے بیان سے جوڑ کر آگے بڑھ رہے ہوتے ہیں۔ مگر قاری سمجھتا ہے کہ یہ واقعہ تو اس نے ان کے پہلے مضمون میں پڑھا ہے۔ اسی باعث انکی تحریر میں ان کے افکار کے بیان میں تکرار کے باعث تنوع کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ مگر ایک ہی موقف اور ایک ہی استدلال اور اس کی تکرار ان کے سیاسی اور مذہبی عقائد کی مضبوطی کی آئینہ دار بھی ہے۔ ان کے مضامین کا لہجہ جتنا بھی کھرا اور کھردرا ہو مگر ایک دلچسپ اور باوقار بات جو ان کی تحریروں کو دیگر کمیونسٹوں کی تحریروں سے جدا اور ممتاز کرتی ہے۔ وہ مذہب کے بارے میں ان کا موقف ہے۔ عام طور پر کمیونسٹوں کی تحریروں میں مذہب کے بارے میں سطحی اعتراضات اور نازیبا کلمات کی بھرمار ملتی ہے۔ (افسانوں کا مجموعہ 'انگارے' مذہب اور جذبات پر رکیک حملے کی بدترین مثال ہے) احمد بشیر جہاں بھی مذہب کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کا لہجہ دھیما اور انداز حکیمانہ ہے۔ وہ ملائیت کے شدید مخالف ہیں۔ وہ ملا کے بارے میں کھل کر اپنی بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ پاکستان کی مذہبی جماعتوں کے تو انھوں نے خوب لتے لیے ہیں۔ روزنامہ مساوات کے صفحات اس کی گواہی دیتے ہیں۔ جماعت کی اس شدت سے مخالفت کا یہ عالم ہمیں جناب غلام احمد پرویز کے رسالے ''طلوع اسلام'' کی یاد دلاتا ہے۔ جس کا اولین مقصد مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی فکر کی تغلیط و تردید ہوا کرتا تھا۔ احمد بشیر نے جماعت اسلامی اور ملا پر کھل کر تنقید کی ہے۔ جماعت اسلامی یا دیگر اسلامی جماعتوں سے اختلاف کرتے وقت بعض جگہوں پر ان کے مؤقف میں سطحیت بھی آ گئی ہے۔

احمد بشیر کے خاکوں، مضامین، کالموں اور ناول کے غائر مطالعے کے بعد فنی محاسن و معائب سے قطع نظر، ان کی تمام تحریروں میں پایا جانے والا استدلال قاری کو غور و فکر کے نئے سفر پر روانہ کرتا ہے۔ احمد بشیر قائد اور اقبال سے محبت اور ہندو ذہنیت سے بیزاری کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ وہ بطور انسان ہر کسی سے پیار کرتے ہیں۔ ان کا دل ہندو اور مسلمان دونوں پر ہونے والے مظالم پر کڑھتا ہے۔ غیر مسلم پر ہونے والے ظلم پر وہ بطور مسلمان خود کو مجرم اور قصوروار گردانتے ہیں، اگر ان کی تحریروں میں پسند اور ناپسند کے معیارات قائم کئے جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ اول و آخر کمیونسٹ تھے۔ مگر ایسے کمیونسٹ جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی حقانیت اور مطلق العنانی کو تسلیم کرتے ہوئے انسانی مطلق العنانی اور سرمایہ داری اور جاگیردار کو للکارا۔ اور یہ بھی طے ہے کہ انھوں نے جس طریقے سے کمیونزم کی تشریح کی وہ بہت کم لوگوں نے کی۔ وہ اشتراکیت جو دنیا میں خاک بوس ہوگئی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تھیوری غلط نہیں بلکہ پریکٹس غلط تھی۔ وہ زندگی میں ایسا انقلاب چاہتے تھے، جو مسخ تہذیبوں اور فرسودہ رسوم اور مذہب کی سرمایہ دارانہ تفہیم کے مطابق نہ ہو۔ انتظار حسین نے ان کے اندر ایک ایسے انقلاب کی جو درحقیقت انقلاب ہو، کی تڑپ کو دیکھتے ہوئے اپنی کتاب چراغوں کا دھواں میں انھیں ''انقلاب کا بھوکا'' قرار دیا تھا۔

احمد بشیر کی تمام تر تحریروں میں، خواہ وہ مضامین ہوں، خاکے ہوں، یا ناول۔ ان تمام کے مطالعے میں احمد بشیر کے افکار اور عقائد کی جھلک صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ انھوں نے کسی بھی فن پارے میں فنی مجبوری یا صنفی ضرورت کے تحت اپنی فکر کو پس پشت نہیں ڈالا۔ اس اعتبار سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ رائٹر سے زیادہ ایک ریفارمر تھے اور اس راہ میں آنے والے ہر مقام پر قیام کے دوران بھی انھوں نے اپنے سفر کی غایت کو پیش نظر رکھا۔ انہوں نے عمر بھر سچ لکھا، یا جسے وہ سچ سمجھتے تھے وہی لکھا۔ انھوں نے کسی کو خوش کرنے کے لیے نہ ہی سچ لکھا، اور جھوٹ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ احمد بعض اوقات ضرورت سے زیادہ سچ لکھ جاتے تھے۔ کیا سچ کا بیان کسی معاشرے کی اقدار اور اصولوں کے تابع ہونا چاہئے کہ نہیں، یہ ایک الگ بحث ہے مگر شاید انھوں نے خود کو یہ حلف دے رکھا تھا۔ کہ ''جو بھی لکھوں گا سچ لکھوں گا۔ سچ کے سوا کچھ نہ لکھوں گا۔'' ان کا سچ بعض موقعوں پر اچھی خاصی نزاعی کیفیت پیدا کر دیتا تھا۔ ان کے زیادہ تر جرائد کو چھوڑنے کا یہی سبب ہے۔

پاکستان کی تاریخ میں جاگیرداروں کی ریشہ دوانیوں اور بیوروکریسی کے کردار کا بھی بار بار تذکرہ اور قائداعظم کی تقریر اور ان کے ایسے فرمودات اور ملفوظات کا حوالہ بار بار دیا گیا ہے جو ان کے موقف کی مضبوط دلیل بنتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے اپنے ساتھ حکمرانوں کے روا رکھے جانے والے

ظلم کا متعدد مرتبہ ذکر کیا ہے۔جس کے نتیجے میں انہیں کئی اخبارات سے نکالا یا نکلوا دیا گیا۔جس کے باعث ان کی نصف صحافتی زندگی اسی طرح بے روزگاری میں کٹ گئی۔اس کے علاوہ انھوں نے اپنی اس بے سروسامانی کا ذکر کچھ ایسے مبہم انداز میں کیا ہے کہ قاری یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ وہ اپنی محرومیوں اور تہی دامنی کا ذکر کر رہے ہیں یا پھر اپنے توکل اور بے نیازی کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔حالانکہ انھوں نے یہ برملا کہا ہے کہ مجھے کسی قسم کا ملال نہیں۔مگر ہر پھر کر بار بار اپنی ملکیت نہ ہونے کا تذکرہ، بیٹی کے پاس رہائش اور بیٹے کے اندوختہ پر گزراوقات کا تذکرہ قاری کو شک میں مبتلا کر دیتا ہے۔وہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ وہ شخص جس کی ساری زندگی سچ لکھنے اور سچ بولنے میں صرف ہوئی اس کا ماحصل قابل افتخار ہے یا باعث عبرت! سچ۔۔

احمد بشیر کے کالم ہوں مکاتیب ہوں، خاکے ہوں یا پھر ان کا ناول؛ ان کی سب تحریروں میں ایک فکری نامیاتی رابطہ اور تسلسل محسوس ہوتا ہے۔وہ پاکستانی حکومتوں کی منظور شدہ تاریخ کے بجائے تاریخ پاکستان کے ان ابواب کے در کھولتے ہیں جو ناگفتنی قرار دے کر یا نظریۂ ضرورت کے تحت بند کر دیے گئے۔احمد بشیر کی تحریروں میں متعدد جگہوں پر قائد اور اقبال سے محبت اور عقیدت کے جذبات کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجزن ہے۔ان کا دل ہندو اور مسلمان دونوں پر ہونے والے مظالم پر دکھتا ہے۔غیر مسلم پر ہونے والے ظلم پر وہ بطور مسلمان خود کو مجرم اور قصوروار گردانتے ہیں مگر ہندو رہنماؤں اور کرتا دھرتا ہندوؤں کی متعصبانہ ذہنیت بھی ان سے پوشیدہ نہیں۔ان کی تحریروں میں بطور انسان ایک ایسے مسلمان کا سراپا ابھرتا ہے جو اپنے قول و فعل کے تضاد سے پاک ہے۔ان کے معاشرتی رویے عدل و انصاف پر مبنی ہیں۔وہ جو دوسروں کی اولاد کے لیے سوچتے ہیں وہی اپنی اولاد کے لیے سوچتے ہیں۔وہ بیک وقت ملا اور منافق سوشلسٹوں سے بیزار ہیں۔اگر فکری سطح پر ان کی تحریروں میں پسند اور ناپسند کے معیارات قائم کیے جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ اول و آخر کمیونسٹ تھے۔ایسے کمیونسٹ جو اللہ تعالیٰ کی حقانیت اور مطلق العنانی کو تسلیم کرتے ہوئے انسانی مطلق العنانی اور سرمایہ داری اور جاگیرداری کے خلاف جہاد بالقلم کرتے رہے۔ان کی تحریروں سے ان کے وسیع المطالعہ ہونے کا پتا چلتا ہے۔عالمی و اسلامی تاریخ ہو یا عمرانی معاہدے یا دنیا میں وقتاً فوقتاً اٹھنے والی تحریکیں، ان کی گفتگو اور تحریر سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ وہ ایک وسیع المطالعہ ہی نہیں جملہ عمرانی علوم و فنون کے بارے میں تجزیاتی نقطۂ نظر رکھتے تھے۔انھوں نے جس طریقے سے کمیونزم کی تشریح کی وہ بہت کم لوگوں نے کی۔ان کے ناول، کالموں اور خاکوں فکر و عمل کی تقرار سے جس سے ایک شائبہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان میں فکری ارتقاء نہیں تھا

مگر ان کی اس ادا کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنا قبلہ جو اختیار کر لیا پھر اسی طرف رخ کر کے گامزن سفر رہے۔ انھوں نے بر آنے والے پیش امام کی اقتدا نہیں کی۔ انھوں نے اپنا قبلہ نہیں بدلا۔ ان کا یہی عمل اور ایقان یا ثابت قدمی انہیں اپنے دیگر ہمعصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ انھوں نے زندگی کے خوبصورت چہرے کو منافقت، مصلحت اور تعصب کے تیزاب سے مسخ کرنے والے لوگوں کے خلاف جہاد جاری رکھا۔ احمد بشیر کی زندگی بہت کٹھنائیوں، تکلیفوں اور پریشانیوں میں گزری۔ غالب نے تو کہہ دیا تھا:

زندگی اپنی جو اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مگر احمد بشیر نے ہمدم دیرینہ ممتاز مفتی کے نام ایک خط (۱) میں لکھا: "میں اپنی زندگی سے خوش ہوں۔ مجھے کوئی پشیمانی، کوئی حسرت نہیں۔ مار پڑتی ہے تو پڑتی رہے۔" ان کی زندگی پر اقبالؔ کا یہ شعر پورا صادق آتا ہے۔

اپنے بھی خفا مجھ سے بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

☆☆☆

محمد ظہیر بدر یکم اگست 1958ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ معروف ادیب، شاعر، مدیر اور ماہر تعلیم ہیں۔ آپ ایک عرصہ متحدہ عرب امارات میں اردو کی تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔ آپ مختلف اصناف ادب جیسے سوانح نگاری، ناول، افسانہ، شاعری، اور تحقیق و تنقید کے حوالے سے جانے جاتے ہیں آپ کی اہم کتابوں میں مردان کوہسار صحرائے عرب میں (آپ بیتیاں 1997ء)، واصف علی واصف احوال و آثار (1998ء)، محبتیں ادھوری سی (ناول 2007ء) اور نابغہ عصر واصف علی واصف (2008ء) شامل ہیں۔

اکادمی ادبیات پاکستان کے اشاعتی منصوبے پاکستانی ادب کے معمار کی کتاب 'احمد بشیر شخصیت اور فن' جناب محمد ظہیر بدر نے تحریر کی ہے۔ آپ آج کل مجلس ترقی ادب لاہور سے وابستہ ہیں۔

ISBN: 978-969-472-291-7